تعلیم و تربیت

کہانی نمبر

جنوری 1993

دِل چسپ، حیرت انگیز اور ناقابلِ فراموش کہانیوں سے بھرپُور

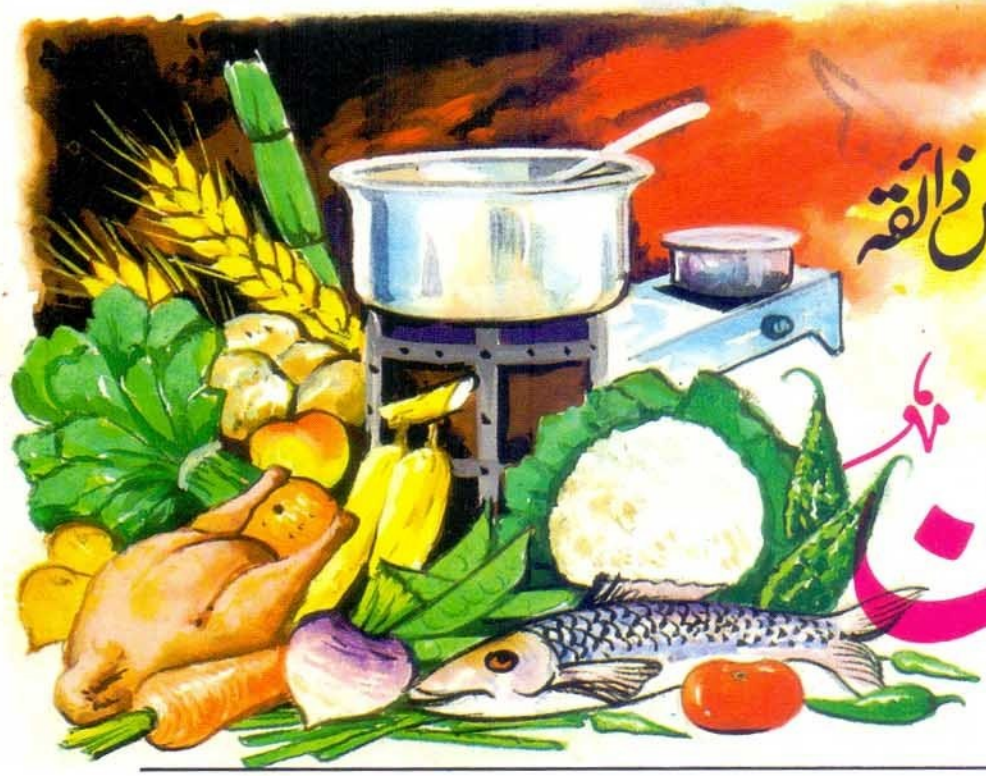

قسم قسم کے لذیذ اور خوش ذائقہ

پکوان

منوّر جہاں کا دسترخوان : سستے اور پُرتکلّف کھانے پکانے کی عام فہم ترکیبیں۔

دیس دیس کے پکوان : ایشیا، افریقہ، یورپ، آسٹریلیا اور امریکا کے لذیذ پکوان۔

صبیحہ کا دسترخوان : کم فرصت خواتین کے لیے طرح طرح کے کھانے، پڈنگ، شربت، جام اور اچار۔

چینی کھانے : چینی کھانوں کے شائقین کے لیے لاجواب کتاب۔

سبزیاں پکائیے : سبزیاں پکانے کی ترکیبیں۔ یہ کتاب منوّر جہاں کے دسترخوان سے مُرتّب کی گئی ہے۔

گوشت پکائیے، مچھلی پکائیے : گوشت اور مچھلی کے ہر قسم کے پکوان۔ یہ کتاب بھی منوّر جہاں کے دسترخوان سے مُرتّب کی گئی ہے۔

میٹھے پکوان : حلوے، زردے، کھیر، سوّیاں، انگریزی پڈنگ اور دیسی مٹھائیاں بنانے کی آسان ترکیبیں۔

فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ

لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

السلام علیکم

لیجیے، یہ رہا آپ کا کہانی نمبر۔ خدا کرے یہ آپ کی توقعات پر پورا اترے اور اسے پڑھ کر آپ بے اختیار کہہ اٹھیں "واہ وا! سبحان اللہ!"

اس مہینے قسط وار ناول "آپریشن سیاچن" ختم ہوگیا ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ آپ نے اسے پسند کیا۔ فیروز سنز عن قریب اسے کتابی شکل میں شائع کر رہے ہیں۔ جو ساتھی، کسی وجہ سے، اس کی پوری قسطیں نہ پڑھ سکے، وہ اسے پورا پڑھ سکیں گے۔

اس ناول کی جگہ، اسی مہینے سے، ایک نیا مختصر ناول "سبز پانیوں کے شہر" شروع کیا جارہا ہے۔ یہ ایشیا کے ایک خوب صورت اور ہرے بھرے ملک ملائیشیا کا دلچسپ و معلوماتی سفر نامہ بھی ہے اور سراغ رسانی و مہم جوئی کے کارناموں سے بھرپور ایک سنسنی خیز کہانی بھی۔ اس کے متعلق اپنی رائے ضروری لکھیے۔

ہمارے بعض ساتھیوں نے لکھا ہے کہ نئے سال سے تعلیم و تربیت میں نئے سلسلے شروع کیے جائیں، لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کس قسم کے سلسلے چاہتے ہیں۔ جو ساتھی تین چار سال سے باقاعدہ تعلیم و تربیت پڑھ رہے ہیں اور ان کے پاس تعلیم و تربیت کے پچھلے پرچے موجود ہیں، وہ انہیں غور سے دیکھیں اور پھر بتائیں کہ شائع شدہ سلسلوں کے علاوہ اور کون سے نئے سلسلے شروع کیے جاسکتے ہیں۔ ان کی تجویزیں اگلے شمارے میں چھاپ دی جائیں گی۔

اس شمارے میں

اداریہ	.....	1			
کہانی کی کہانی (نظم)	حفیظ الرحمٰن احسن	2	سچ کی فتح (کہانی)	ضمیرہ احمد	29
اصلی تحفہ (کہانی)	میرزا ادیب	4	آیئے مسکرائیں	.....	32
چھت پر الو نٹ (کہانی)	ڈاکٹر رؤف پاریکھ	9	آدم خور شیرنی (کہانی)	جم کاربٹ	33
تایا ابا (کہانی)	ذکیہ بلگرامی	11	نئے سال کا پیغام (نظم)	امان اللہ نیر شوکت	38
قید سے فرار (کہانی)	محمد یونس حسرت	15	دھشی کے دو تاریخی قتل	ڈاکٹر عبدالرؤف	39
بادشاہ کا فیصلہ (کہانی)	سید نظر زیدی	20	آیئے دوست بنائیں	.....	40
ہتھ کٹی (کہانی)	ڈاکٹر فصیر احمد ناصر	24	میرے بھیا (کہانی)	رضوانہ سید علی	41
شیر اور چوہا (نظم)	تاج انصاری	26	10 جنوری (کہانی)	شکیل زاہد	43
دلچسپ علمی آزمائش	.....	27	حکایات بوستان سعدی	.....	46
کہانی ایک گلوس کی (کہانی)	ریاض حسین قمر	47			
معما (کہانی)	رازیوسفی	50			
میرکو سوا میر (کہانی)	آمنہ وحید	54			
آپ کا خط ملا	.....	56			
لیبارٹری تباہ ہوگئی (سیریل)	سلیم خان گمی	58			
آپ بھی لکھیے	.....	66			
بوڑھے کی سنیے تو (نظم)	فرحت شاہجان پوری	73			
سبز پانیوں کے شہر (کہانی)	فوزیہ طاہر	74			
ہونہار مصور	.....	79			
عظیم مسلمان	عین الحق فرید کوٹی	80			

52 واں سال

دسواں شمارہ

تعلیم و تربیت

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا بچوں کا محبوب رسالہ

چیف ایڈیٹر: عبدالسلام

ایڈیٹر: ظہیر سلام

جائنٹ ایڈیٹر: سعید لخت

سینیئر اسسٹنٹ ایڈیٹر: ڈاکٹر عبدالرؤف

اسسٹنٹ ایڈیٹر: محمد اقبال ثاقب

آرٹ ڈائریکٹر: محمود حسن بروی

سرکولیشن اسسٹنٹ: محمد بشیر راہی

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور

پبلشر: ظہیر سلام

پرنٹر: عبدالسلام

پتا

ماہنامہ تعلیم و تربیت

32- شارع بن بادیس لاہور

فون:- 361309-361310

سرکولیشن اور اکاؤنٹس

60- شاہراہ قائد اعظم لاہور

سالانہ قیمت

پاکستان میں (صرف رجسٹری کے ساتھ) -/200 روپے

مشرق وسطیٰ/افریقہ (ہوائی ڈاک سے) -/250 روپے

یورپ (ہوائی ڈاک سے) -/300 روپے

امریکہ/مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے) -/330 روپے

جنوری 1993

عام شمارہ -/9 روپے

کہانی نمبر -/12 روپے

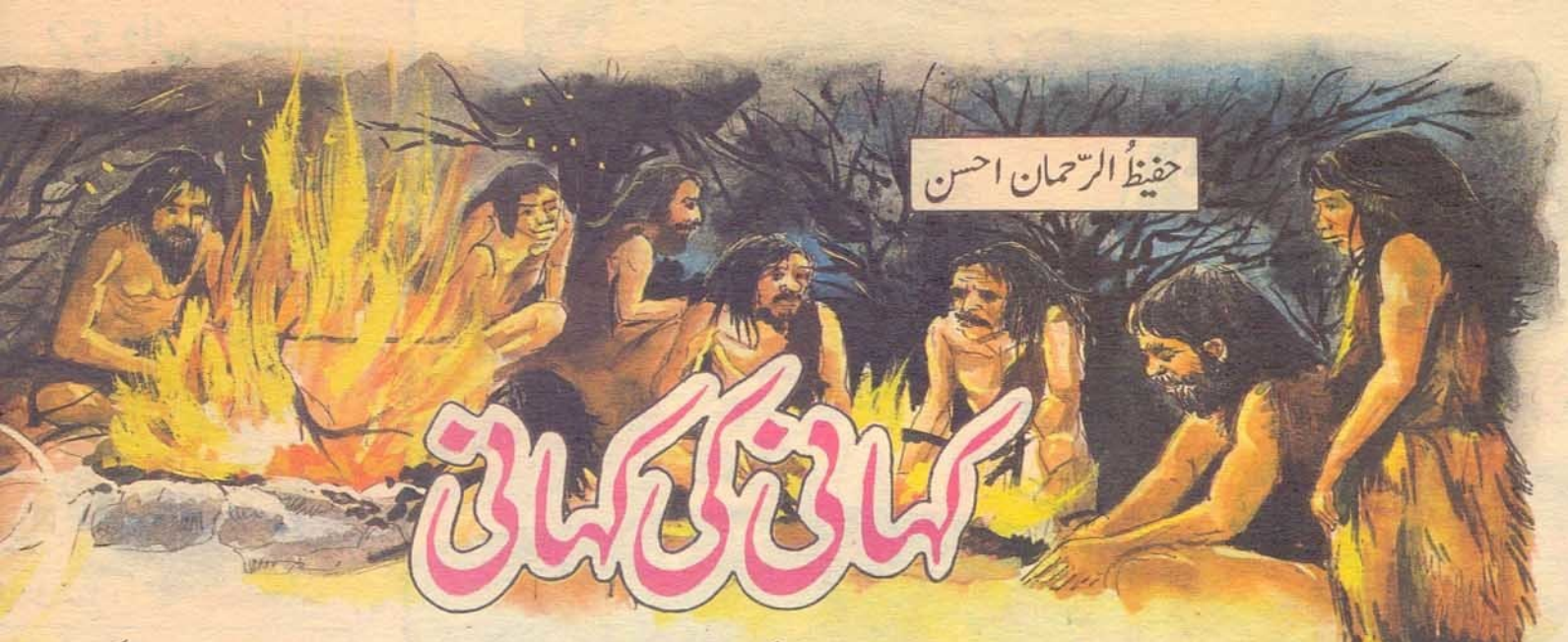

کہانی کی کہانی

حفیظُ الرّحمان احسن

زمیں آسماں جب بنائے گئے
فلک پر سِتارے سجائے گئے

زمیں پہلے پہلے تھی ساری اُجاڑ
پھر اُس پر جمائے گئے کچھ پہاڑ

پہاڑوں سے دریا بہائے گئے
بہُت خوب منظر سجائے گئے

درخت اور پھل پھول اُگائے گئے
مزے دار موسم بنائے گئے

پھر اِنساں کو جنّت سے لایا گیا
یہاں لا کے اُس کو بسایا گیا

پھر آدم کی اَولاد پھولی پھلی
یہاں سے وہاں پھیلتی ہی گئی

سُکوں سے گزرنے لگی زندگی
مگر کوئی لگتی تھی اُس میں کمی

سبھی خوش تھے، پر وقت کٹتا نہ تھا
نظر میں جو منظر تھا، ہٹتا نہ تھا

گزرتا تھا دن کام میں ہر گھڑی
مگر رات تو ختم ہوتی نہ تھی

پھر اِک رات کی بات ہے، دوستو
ہُوا واقعہ جو، وہ ہم سے سُنو

تھی سردی کی رات اور اِکٹھے تھے لوگ
اَلاؤ کے گِرد آ کے بیٹھے تھے لوگ

"کوئی بات چھیڑو" کہا ایک نے
کہ سارے تھے خاموش بیٹھے ہوئے

بہُت کچھ تھا جی میں، پر کہتے نہ تھے
جھجکتے تھے سب بات کرتے ہُوئے

بزُرگ اِک تھا اُن میں سیانا بہُت
حقیقت یہ ہے، تھا وہ دانا بہُت

زباں اُس نے کھولی بہُت سوچ کر
جو بیٹھے تھے لوگ اُن پہ ڈالی نظر

کہی پہلے اِک بات، پھر دُوسری
یُونہی بات سے بات جُڑتی گئی

مزہ اُس کی باتوں میں آیا عجَب
تھے حیران اِس تجربے سے وہ سب

ڈھلی رات، سورج نکلنے لگا
رہا کچھ نہ اِحساس ہی وقت کا

کسی کی سمجھ میں نہ آئی یہ بات
ہُوئی ختم کیسے یہ باتوں میں رات
جو باتوں ہی باتوں میں بنتی گئی
کہانی یقیناً وہ دِلچسپ تھی
مگر دوستو ، تھی کہانی وہ کیا؟
یہ بات اب کوئی بھی نہیں جانتا
یہ اچّھا تھا ، لِکھ لیتا کوئی اُسے
مگر لِکھنا پڑھنا تھا آتا کسے؟
نہ تب لکھنے پڑھنے کا تھا کچھ رِواج
زبانی ہی چلتے تھے سب کام کاج

بس اِتنی کہانی کی بُنیاد تھی
یہ پہلی کہانی کی اِیجاد تھی

ہُوا خُوب چرچا پھر اِس بات کا
یہاں اور وہاں چل پڑا سِلسِلہ
کہانی کی جمنے لگیں مجلسیں
کہے کوئی ایک ، اور سارے سُنیں
ہے صدیوں پُرانی اگرچہ یہ بات
مگر جس طرح روز آتی ہے رات
ہے جاری کہانی کی یہ داستاں
رہے گی یہ ندّی کی صورت رواں
بدلتے رہیں گے کہانی کے رنگ
ہمیشہ یہ اِنساں کو رکھّیں گے دنگ
یہ قصّے ، فسانے ، ڈرامے تمام
کہانی کے بدلے ہُوئے ہیں یہ نام

کہانی کی ہے بس کہانی یہی
یہی ہے پُرانی ، یہی ہے نئی

بس آخر میں اِک بات کہنی ہے اور
توجّہ سے کرنا ضرور اِس پہ غور
کہانی وہ اچّھی جو سچّی بھی ہو
جو سچّی بھی ہو اور اچّھی بھی ہو
بس ایسی کہانی کہو اور سُنو
سنوّارے جو ذہن اور اَخلاق کو
جو دے تجربوں کی حسیں روشنی
ملے جس سے عِلم اور بڑھے عقل بھی

جو دِل میں تھی وہ بات ، ہم نے کہی
لو اب تم سُناؤ ، کہانی کوئی

اصلی تحفہ

میرزا ادیب

ایک قصبے کے ایک چھوٹے سے گھر میں ایک چھوٹا سا کنبہ رہتا تھا۔ اُس میں تین آدمی تھے، ایک اَدھیڑ عُمر کا شوہر، دُوسری اُس کی بیوی اور تیسرا اُن کا بارہ سالہ لڑکا، عامِر۔

شوہر اکثر بیمار رہتا تھا۔ گلی میں اُس کی دودھ دہی کی دکان تھی۔ گرمیوں میں اُس کو اچھّی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی مگر سردیوں میں اُس کی دکان پر دہی بہُت کم فروخت ہوتا تھا۔ دودھ بھی اِتنا نہیں بِکتا تھا کہ گھر کی ضرورتیں آسانی سے پوری ہو جائیں۔ اِن مہینوں میں اُس کی بیوی بہُت سوچ سمجھ کر خرچ کرتی تھی۔

اُن کا بیٹا عامِر بہُت خوش اَخلاق، اِطاعت شِعار اور محنتی لڑکا تھا۔ ساتویں جماعت تک ہمیشہ کلاس میں اوّل رہا تھا۔ آٹھویں جماعت کا سالانہ اِمتحان ہونے والا تھا اور اُس کے اُستادوں کو یقین تھا کہ وہ اِس مرتبہ بھی بہُت اچھّے نمبروں سے پاس ہو گا۔

عامِر کو کھیل کُود سے بہُت کم دلچسپی تھی۔ اُس کو کہانیوں کی کتابیں پڑھنے کا بڑا شوق تھا۔ اِسکول کا کام وہ اِسکول سے واپسی پر کھانا کھانے کے بعد کر لیتا تھا۔ اِس کے بعد رات تک کہانیاں پڑھتا رہتا۔

اُس کے دوست اُسے کھیلنے کے لیے نہر کے کنارے باغ میں چلنے کے لیے کہتے تو مشکل سے تیار ہوتا اور جاتا بھی تو کوئی نہ کوئی کتاب لے جاتا۔ دوست تو کھیل کُود میں مشغول ہو جاتے اور وہ باغ کے ایک کونے میں بیٹھ کر کتاب کا مُطالعہ کرنے لگتا۔

عامر کو ہر قسم کی کہانیوں سے دلچسپی تھی۔ کہانی کسی بادشاہ، شہزادے یا شہزادی کی ہو یا کسی مُہم کا قصّہ، وہ تمام کہانیاں شوق سے پڑھتا۔ اور جس کہانی کو خاص شوق سے پڑھتا، اُس کے واقعات وہ رات کو سوتے میں بھی دیکھا کرتا اور کسی خوفناک منظر پر چیخ بھی پڑتا تھا۔ ایسے میں اُس کی ماں اُس کا بازُو ہلا کر کہتی "عامر، بیٹا، کیا ہُوا"؟

"کچھ نہیں امّی۔ وہ کہانی یاد آ گئی تھی"۔

"تو بیٹا، ایسی کہانیاں کیوں پڑھتے ہو جو تمہیں سوتے میں ڈرا دیتی ہیں؟"

ایک دن ایسا ہُوا کہ اُس کے ایک اُستاد نے اُسے ایک کتاب دے کر کہا "اِس کتاب میں بڑی دلچسپ اور مزے دار

کہانیاں ہیں۔ میں نے اپنی طالبِ علمی کے زمانے میں اِسے پڑھا تھا۔ کل کتابوں کی ایک دکان پر نظر آ گئی تو خرید لیا۔ اِسے میری طرف سے تُحفہ سمجھو۔"

عامر نے اُستاد کا شکریہ ادا کیا اور کتاب بستے میں رکھ کر گھر لے آیا۔ اُس روز گھر میں مہمان آئے ہوئے تھے۔ عامر کو ہوم ورک نہیں ملا تھا، اِس لیے اُس نے سوچا کہ کھانا کھانے کے بعد تھوڑی دیر آرام کرے گا اور پھر اِس کتاب کو پڑھے گا۔

کتاب میں سات کہانیاں تھیں اور اُس کا نام بھی سات کہانیاں ہی تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ شام تک ساری کہانیاں پڑھ لے گا مگر چُوں کہ گھر میں مہمان آ گئے تھے اور اُسے اُن کی خاطر تواضُع کے لیے بازار سے چیزیں خرید کر لانا تھیں، وہ کتاب کی طرف توجّہ نہ کر سکا۔

شام ہونے میں ایک ڈیڑھ گھنٹا باقی تھا کہ مہمان تو چلے گئے لیکن اُس کے چند دوست آ گئے۔ وہ اِصرار کرنے لگے کہ وہ اُن کے ساتھ باغ میں چل کر کھیلے۔ اُس نے کہا کہ اُسے گھر میں ضروری کام ہے لیکن اُس کی ایک نہ چلی۔

بات یہ تھی کہ عامر کو اپنے ہمراہ لے جانے میں اُن کا اپنا فائدہ تھا۔ عامر کھیل کود میں تو حصّہ لیتا ہی نہ تھا، الگ بنچ پر بیٹھ کر یا تو اُنہیں کھیلتے ہوئے دیکھا کرتا یا کتاب پڑھنے لگتا۔ اُس کے دوست اپنے جوتے، سویٹر وغیرہ اُس کے پاس چھوڑ جاتے اور مُطمئن ہو جاتے کہ اُن کی یہ چیزیں محفوظ رہیں گی۔

اُس شام کو بھی یہی ہُوا۔ اُس کے دوست اپنی چیزیں اُس کے سپرد کر کے کھیل کود میں مصروف ہو گئے۔ شام ہونے والی تھی لیکن کُھلی فضا کی وجہ سے ابھی اِتنی روشنی تھی کہ کتاب کا مُطالعہ کیا جا سکتا تھا۔ عامر اپنے ساتھ اُستاد کی دی ہوئی کتاب لے آیا تھا اور اُس کی دو کہانیاں پڑھ لی تھیں۔ تیسری کہانی پڑھنے لگا تو وہ اُسے بہت دلچسپ لگی۔ چند ہی مِنٹ میں اُس نے یہ کہانی بھی پڑھ ڈالی۔

یہ کہانی ایک ماہی گیر کے کُنبے کے بارے میں تھی۔ عامر کے کنبے کی طرح ماہی گیر کے کُنبے میں بھی تین لوگ تھے۔ یہاں بھی عامر کے کُنبے کی طرح غُربت تھی۔ ماہی گیر مچھلیاں بیچ کر گھر کے اِخراجات پورے کرتا تھا۔ لیکن کبھی کبھی وہ ایک پیسہ بھی نہیں کما سکتا تھا۔ ایسے میں گھر میں جو کچھ ہوتا، اُس سے یہ کُنبہ پیٹ بھر لیتا۔ ایک شام ماہی گیر واپس آیا تو خالی ہاتھ تھا۔ اُس کی بیوی نے، گھر میں جو کچھ موجود تھا، اُس سے پیٹ بھرنے کا سامان کر لیا۔ اِتّفاق ایسا ہُوا کہ اُنہوں نے کھانا شروع بھی نہیں کیا تھا کہ ایک اجنبی آ گیا۔ اُس نے بتایا کہ وہ راہ بھول گیا ہے اور سخت بھوکا ہے۔ گھر میں کھانے کا سامان بہت کم تھا۔ ماہی گیر، اُس کی بیوی اور بیٹے نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنا کھانا مہمان کو دے دیں گے۔ چُناں چہ اُنہوں نے ایسا ہی کیا۔ صبح ہوئی تو مہمان نے اُن کا شکریہ ادا کیا اور ایک تھیلی جو سِکّوں سے بھری ہوئی تھی، اُن کو دے کر چلا گیا۔

یہ کہانی کوئی خاص کہانی نہیں تھی۔ مگر اِس نے عامر کے ذہن پر گہرا اثر ڈالا۔ اُس کے گھر میں بھی غُربت تھی اور اُس کے کُنبے میں بھی تین ہی لوگ تھے۔ وہ آنکھیں بند کر کے سوچنے لگا، کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کسی روز ہمارے ہاں بھی کوئی ایسا ہی مہمان آ جائے اور ہمیں روپوں سے بھری ہوئی تھیلی دے جائے؟ اِس طرح ابّا جی کا عِلاج بھی ہو سکے گا اور وہ اچھّے کپڑے پہن کر اِسکول جایا کرے گا۔

اُس کے دوست اُس سے کچھ دُور شور مچاتے، اُچھلتے کُودتے رہے اور جب شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تو وہ اُس کی طرف آئے۔ وہ آنکھیں بند کیے سوچوں میں گُم بیٹھا تھا۔

"کیا بات ہے، عامر؟" ایک دوست نے اُس کا کندھا ہِلا کر کہا۔

"کچھ نہیں" عامر نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

راستے میں اُس نے کوشش کی کہ دوستوں سے اپنی کیفیّت چھپائے رکھے۔ وہ اُن کی باتوں میں شریک ہوتا رہا۔ وہ ہنستے تو وہ بھی قہقہہ لگا دیتا۔

گھر آیا تو کھانا کھا کر جلد ہی اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ کھانے کے بعد امّی سے کچھ دیر باتیں ضرور کرتا تھا اور پھر

سونے کے لیے جاتا تھا۔ مگر اُس رات اُس نے ایسا نہ کیا۔

اُس نے چاہا کہ کوئی اور کتاب پڑھے اور پڑھتے پڑھتے سو جائے۔ مگر اُس نے وہی کتاب اُٹھالی جس کی تین کہانیاں وہ شام کے وقت باغ میں پڑھ چکا تھا۔

اُسے اب چوتھی کہانی پڑھنی چاہیئے تھی، مگر اُس نے پھر وہی کہانی پڑھنی شروع کر دی جسے وہ پڑھ چکا تھا۔

"کیا ایسا اجنبی ہمارے گھر نہیں آ سکتا جیسا ماہی گیر کے گھر آیا تھا؟" اُس نے خود سے سوال کیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ محسوس کرنے لگا کہ ایک رات ایک ایسا اجنبی جس کا لباس امیرانہ ہے، اُن کے دروازے پر آیا ہے۔ اُسے کھانا کھلایا جاتا ہے، بستر پر سُلایا جاتا ہے اور صبح کے وقت وہ اُنہیں ایک قیمتی تحفہ دے کر چلا جاتا ہے۔

وہ کئی مِنٹ خود سے سوال و جواب کرتا رہا، یہاں تک کہ اُس کی آنکھوں میں نیند بھر گئی اور وہ کتاب ہاتھ میں لیے چارپائی کے سرہانے والی دیوار سے پُشت لگا کر سو گیا۔

کافی رات گزر گئی۔ اُس کی ماں کی آنکھ کُھلی تو اُس نے اُس کے کمرے میں روشنی دیکھی۔ وہ اُس کے کمرے کی طرف گئی تو دیکھا کہ عامر نے نہ صرف بتّی نہیں بُجھائی ہے بلکہ ٹھیک طور پر لیٹا ہُوا بھی نہیں ہے۔

"عامر بیٹا" اُس نے بیٹے کے شانے کو ہِلاتے ہوئے کہا۔

عامر کی آنکھ کھل گئی۔

"بیٹا، دیکھو، کتاب اِس طرح نہیں پڑھا کرتے جس طرح تُم پڑھتے ہو۔ کُھلی کتاب ہاتھ میں ہوتی ہے اور تم سو چکے ہوتے ہو۔"

عامر ماں سے کہنا چاہتا تھا کہ امّی، میں نے ایک کہانی پڑھی ہے جس میں ایک مُسافِر ماہی گیر کے گھر آتا ہے اور ___"

"کیا سوچ رہے ہو بیٹا؟"

"امّی، کبھی ہمارے ہاں کوئی ایسا مُسافِر راستہ بھول کر آیا ہے جسے ہم نے کھانا کِھلایا ہو اور ___" عامر آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

"نہیں، بیٹا، ہمارے ہاں کبھی کوئی اجنبی راستہ بھول کر نہیں آیا۔"

"شاید کبھی آ جائے۔"

ماں نے اُسے غور سے دیکھا اور سوچنے لگی، ضرور اِس نے کوئی ایسی کہانی پڑھی ہے جس میں کوئی اجنبی کسی کے گھر آتا ہے۔ اُس نے مسکرا کر پوچھا "مگر تمہیں اُس اجنبی کا کیوں اِنتظار ہے؟"

"میں بھلا کیوں اِنتظار کروں گا؟ ___ لیکن امّی، ایسا ہو تو سکتا ہے نا؟"

"چھوڑو اِن باتوں کو۔ یہ کہانیوں کی باتیں ہیں۔ آرام سے سو جاؤ۔ صبح اِسکول جانا ہے"۔ یہ کہہ کر اُس کی ماں نے بتّی بُجھا دی۔ عامر لحاف میں گھُس گیا، کچھ دیر اپنے آپ سے وہی سوال جواب کرتا رہا اور پھر سو گیا۔

دن گزرتے رہے۔ عامر آٹھویں سے نویں جماعت میں آ گیا اور پھر ایک سال بعد اُس نے دسویں جماعت کا اِمتحان بھی بہت اچھے نمبروں سے پاس کر لیا۔ وہ اب بھی کسی اجنبی کا اِنتظار کرتا تھا۔ کبھی کبھی کوٹھے پر جا کر دور دور تک دیکھتا اور کبھی اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر نگاہیں دوڑاتا تھا۔

دسویں جماعت کا اِمتحان پاس کیے اُسے دس روز ہو چکے تھے۔ اُس نے ہمسائے میں دو بھائیوں کو جو چوتھی اور پانچویں جماعت میں پڑھتے تھے، اُن کے گھر جا کر پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ اِس سے تھوڑی سی آمدنی ہو جاتی تھی۔

ایک شام آسمان پر سیاہ بادل منڈلا رہے تھے، تیز ہوا چل رہی تھی اور اندھیرا تیزی سے پھیلتا جا رہا تھا۔ لوگ جلدی جلدی اپنے کاموں سے فارغ ہو کر گھروں کو لَوٹ رہے تھے۔ عامر کھانا کھانے کے بعد اپنے کمرے میں جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

"عامر بیٹا، باہر کوئی ہے" اُس کی ماں نے کہا۔

عامر کے دل کی دھڑکن فوراً تیز ہو گئی۔ وہ اُٹھ کر دروازے پر گیا۔ وہاں ایک شخص کھڑا تھا جس کا لباس بڑا شان دار تھا۔ عامر کو خوشی بھی ہوئی اور حیرت بھی۔

"جی، فرمایئے"؟ اُس نے پوچھا۔

"بیٹا" اجنبی کہنے لگا "میری گاڑی خراب ہو گئی ہے۔ اِس وقت کوئی مستری نہیں مل سکتا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میں یہ رات آپ کے گھر میں بسر کر لوں؟"

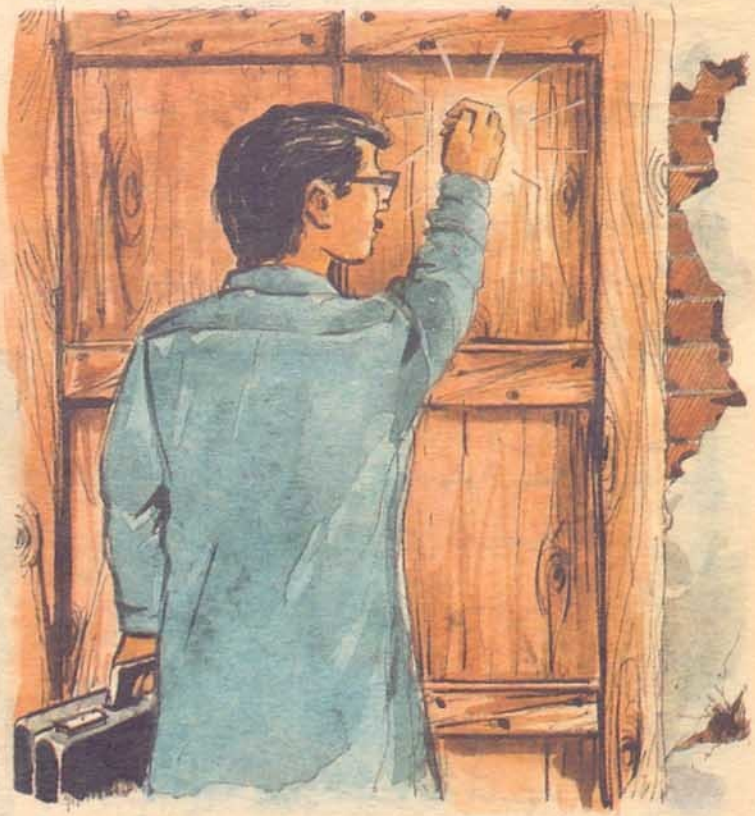

عامر کو اُس کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ تاہم وہ تیزی سے اپنے والِد اور والِدہ کے پاس پہنچا اور اُنہیں اجنبی کی بات بتا دی۔ عامر کے ابّا اور امّی دروازے پر گئے اور اجنبی کو اندر لے آئے۔ اجنبی نے باتوں باتوں میں بتایا "نہر کے دوسرے کنارے ایک کالونی بن رہی ہے۔ بہت سے مکانات بن چکے ہیں۔ میں وہاں ٹھیکے داری کرتا ہوں۔ مکان بنا کر فروخت کرتا ہوں۔ میرا گھر شہر میں ہے۔ گھر جا رہا تھا کہ گاڑی خراب ہو گئی۔"

عامر کے ابّا جی نے اُسے اپنے کاروبار کے بارے میں بتایا۔ عامر نے بھی اپنے مُتعلِّق بات کی، اور جب اجنبی کو، جس نے اپنا نام اِبراہیم بتایا تھا، یہ معلوم ہُوا کہ عامر نے اب تک ہر اِمتحان میں بہت اچھی پوزیشن حاصل کی ہے اور دسویں جماعت کا اِمتحان بھی اِمتیازی نمبروں سے پاس کیا ہے تو اُس نے محبّت و شفقت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

اجنبی کو یہاں آئے آدھ پَون گھنٹا گزرا تھا مگر ابھی تک اُس کی خاطِر تواضُع نہیں ہوئی تھی۔ عامر کے ابّا جی نے پوچھا معاف کیجیے، ہم نے یہ تو پُوچھا ہی نہیں کہ آپ کھانا کھائیں گے؟"

ٹھیکیدار ابراہیم بولا "بھائی صاحِب، مجھے بھوک تو لگی ہے مگر آپ کھانا کھا چکے ہوں گے۔"

"کوئی بات نہیں" عامر کی امّی بولیں اور اُٹھ کر کھانا پکانے کی تیاری کرنے لگیں۔

مہمان نے شِکم سیر ہو کر کھانا کھایا اور پھر بولا "میری بھوک تو دور ہو گئی ہے۔ اب مہربانی کر کے سونے کا بھی اِنتظام کر دیں۔"

عامر اُسے اپنے کمرے میں لے گیا، اور خود سونے کے لیے اپنے ابّا جی اور امّی کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ماہی گیر والے مہمان کی طرح ٹھیکیدار بھی ہمیں کوئی شاندار تُحفہ دے کر جائے گا، مثلاً نوٹوں سے بھری ہوئی کوئی تھیلی۔

صبح ہوئی تو ٹھیکیدار نے ناشتا کیا اور پھر عامر کے سر پر بڑی

شفقت سے ہاتھ پھیر کر بولا "عامر بیٹا، تم بہت اچھّے بچّے ہو۔ اِن شاء اللہ بڑی ترقّی کرو گے۔ کبھی میری ضرورت پڑے تو نہر کے دوسرے کنارے، جہاں نئی آبادی بن رہی ہے، آ جانا۔" یہ کہہ کر اُس نے اُن کا شکریہ ادا کیا اور پھر چلا گیا۔

عامر بہُت مایوس ہُوا۔ "ماہی گیر والا مہمان کتنا اچھّا تھا اور یہ کتنا بُرا ثابت ہُوا" اُس نے خود سے کہا۔

عامر کو دسویں جماعت پاس کرنے کے بعد مُلازمت کے لیے کوشش کرنی چاہیئے تھی کیوں کہ اُس کا باپ بوڑھا ہو گیا تھا اور بیمار رہتا تھا۔ محلّے کے دو بچّوں کو وہ پڑھا رہا تھا مگر اِس سے بہُت کم آمدنی ہوتی تھی۔ اُس نے اِدھر اُدھر دفتروں میں جا کر ہاتھ پاؤں مارے، لیکن معمولی سی مُلازمت بھی نہ مِل سکی۔ ایک روز وہ دفتروں کے چکّر لگا کر تھکاوٹ سے چُور گھر آیا تو ماں نے اُس کا چہرہ دیکھ کر ہی اندازہ لگا لیا کہ اُس پر کیا گزُری ہے۔ وہ بولی "عامر بیٹا، کچھ یاد ہے؟"

"کیا، امّی"؟ اُس نے پوچھا۔

"وہ جو ٹھیکیدار اُس رات ہمارے گھر آیا تھا، اُس نے تُم سے کیا کہا تھا؟"

"یاد ہے، امّی۔ مگر اِس سے کیا ہو گا؟" عامر نے مایوسی سے کہا۔

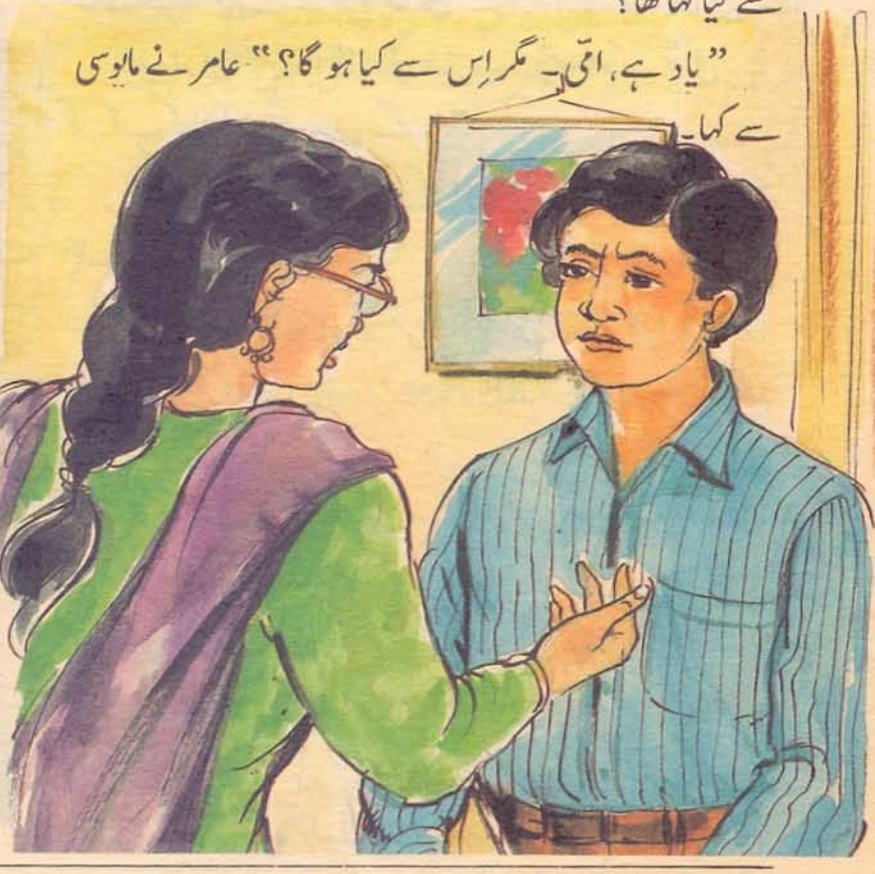

"بیٹا، اُس سے مِل کر دیکھو تو۔ مجھے اُمّید ہے کچھ نہ کچھ ضرور ہو جائے گا۔"

"اچھّا، امّی۔ آپ کہتی ہیں تو کل چلا جاؤں گا" اُس نے بے دِلی سے کہا۔

دوسرے روز صبح سویرے ناشتا کر کے وہ نہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ پَون گھنٹے کے سفر کے بعد نہر کے دوسرے کنارے وہ اُس جگہ پہنچ گیا جہاں مکانات بن رہے تھے، سڑکیں تعمیر ہو رہی تھیں، درخت لگائے جا رہے تھے، بجلی کے کھمبے نصب کیے جا رہے تھے، نلکوں کے لیے جا بجا زمین کھودی جا رہی تھی۔ ہر طرف کام ہو رہا تھا۔

ٹھیکیدار تک پہنچنے میں اُسے کوئی دِقّت پیش نہ آئی۔ وہ عامر سے مل کر بہُت خوش ہُوا اور کہنے لگا "اگر آج تم نہ آتے تو کل میرا آدمی تمہیں لانے کے لیے تمہارے گھر جاتا۔"

اُس نے عامر کو پہلے تو سیر کرائی، پھر کھانا کھلایا اور کہنے لگا "عامر بیٹا، یہاں ایک اِسکول کھُل چکا ہے۔ ہمیں چار اُستادوں کی ضرورت ہے۔ تین آ چکے ہیں۔ تم چوتھے ہو۔ تنخواہ معقول ہے۔ رہنے کے لیے مکان ملے گا۔ ہر طرح کی سہُولت ہو گی۔ کل سے ڈیوٹی پر آ جاؤ۔"

عامر نے گھر جا کر یہ بات اپنے ماں باپ کو بتائی تو وہ خوش ہو گئے۔

دوسرے روز ہی وہ ڈیوٹی پر حاضر ہو گیا۔ ایک مہینے کے بعد اُسے تنخواہ ملی تو وہ حیران رہ گیا۔ کافی معقول تنخواہ تھی اور اُسے رہنے کے لیے ایک مکان بھی دیا گیا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کو بھی وہیں لے گیا۔

وہ اِسکول میں تو پڑھاتا ہی تھا، کچھ لڑکے اُس سے گھر پر بھی پڑھنے لگے۔ اُس کی آمدنی میں خاصا اِضافہ ہو گیا۔

گھر میں خوش حالی آ گئی۔ اُس نے باپ کا عِلاج بھی کرانا شروع کر دیا۔ وہ سوچا کرتا، اصلی تحُفہ تو مجھے ٹھیکیدار صاحِب نے دیا ہے۔ بے کار رہ کر خواب دیکھنے سے کچھ نہیں ملتا۔ جو کچھ ملتا ہے، اپنی محنت اور مُشقّت سے ملتا ہے۔"

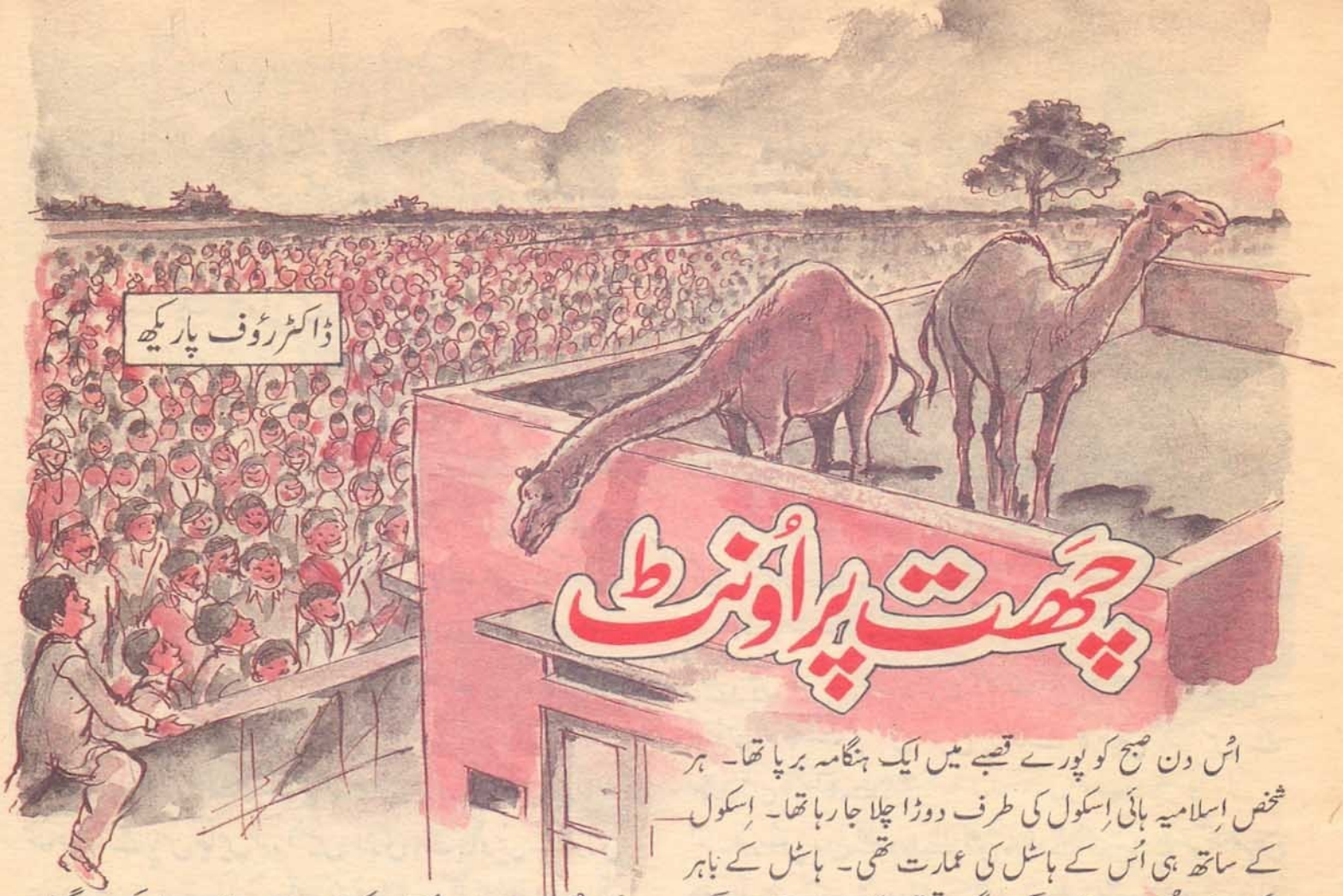

چھت پر اُونٹ

ڈاکٹر رؤف پاریکھ

اُس دن صبح کو پورے قصبے میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ ہر شخص اِسلامیہ ہائی اِسکول کی طرف دوڑا چلا جا رہا تھا۔ اِسکول کے ساتھ ہی اُس کے ہاسٹل کی عمارت تھی۔ ہاسٹل کے باہر لوگوں کا ہجُوم تھا۔ کچھ لوگ قہقہے لگا رہے تھے اور کچھ مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہے تھے۔ پولیس اور میونسپلٹی کے آدمیوں کا بُرا حال تھا۔ سب کے ہاتھ پاؤں پھُولے ہوئے تھے۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں؟

بات ہی کچھ ایسی تھی۔ ہاسٹل کی ایک منزلہ عمارت کی چھت پر دو اُونٹ کھڑے تھے۔ وہ چاروں طرف گھومتے لیکن اُترنے کا راستہ نہ پا کر بِلبِلانے لگتے۔ چھت کا زینہ نہ تھا۔ ضرورت کے وقت لکڑی کی سیڑھی لگا کر اُوپر چڑھتے تھے۔ لوگ حیران تھے کہ اُونٹ چھت پر کس طرح چڑھ گئے؟ اُونٹوں والا سر پکڑے کھڑا تھا۔ ہیڈ ماسٹر طالب علموں سے پوچھ رہے تھے کہ یہ کس کی حرکت ہے؟ لیکن کوئی ایک لفظ نہیں بول رہا تھا۔

ہُوا یُوں کہ وہ اُونٹ والا پچھلے روز، شام کے وقت، قریب کے ایک گاؤں سے ہمارے قصبے میں آیا تھا۔ یہ اُونٹ اُسے شہر پہنچانے تھے۔ اُس نے سوچا کہ رات اِس قصبے میں گزار لیتے ہیں، اگلی صبح آگے چلیں گے۔ اِسکول کا خالی گراؤنڈ دیکھ کر اُس نے وہاں اُونٹوں کو باندھا اور پاؤں پسار کر سو گیا۔ لیکن اگلی صبح اُٹھا تو اُونٹ نہ پا کر بہت سٹ پٹایا۔ بہت ڈھونڈا پر اُونٹ کہیں نہ ملے۔ اِتنے میں اُسے چھت پر سے اُونٹوں کے بِلبِلانے کی آواز سُنائی دی۔ یہ دیکھ کر اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ اُس کے دونوں اُونٹ چھت پر کھڑے ہیں!

تھوڑی ہی دیر میں لوگ جمع ہونے شروع ہو گئے۔ کسی نے پولیس اور میونسپل کمیٹی کو بھی اِطّلاع دے دی۔ اُونٹ والا سر پکڑے بیٹھا تھا اور بار بار درخواست کر رہا تھا کہ کسی طرح اُس کے اُونٹوں کو نیچے اُتارا جائے۔ لیکن اُتارنے کا مسئلہ جُوں کا تُوں تھا۔ پہلے تو کسی کی کھوپڑی میں یہی نہیں آ رہا تھا کہ اُونٹ اُوپر گئے کیسے؟ اِن کو کس نے اور کس طرح اُوپر چڑھایا؟ اُتارنا تو بعد کی بات تھی۔

آخر سب بڑوں نے سر جوڑ کر فیصلہ کیا کہ پہلے اُس شخص کو تلاش کیا جائے جس نے اُونٹوں کو چھت پر چڑھایا ہے۔ اُسی سے پتا چل سکتا ہے کہ اونٹوں کو چھت پر لے جانے اور نیچے لانے کا طریقہ کیا ہے۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد اُنھوں نے

اِسلامیہ ہائی اِسکول کے بچّوں کو قطاروں میں کھڑا کیا، کیوں کہ اُن کو شُبہ تھا کہ یہ حرکت کسی طالبِ علم کی ہی ہوسکتی ہے۔

جب تمام طالبِ علم قطاروں میں کھڑے ہو گئے تو ہیڈ ماسٹر صاحِب نے ایک چھوٹی سی تقریر کی۔ اُنھوں نے فرمایا "شرارت حد سے گزر جائے اور اُس سے کسی کو تکلیف پہنچے تو وہ شرارت نہیں رہتی، گُناہ بن جاتی ہے۔ یہ غریب اُونٹ والا بہت پریشان ہے۔ سارا قصبہ اِن اُونٹوں کو چھت پر دیکھ کر حیران ہے۔ اِسکول کی بدنامی ہو رہی ہے۔ جس کسی نے بھی یہ حرکت کی ہے، اُسے چاہیئے کہ چُپ چاپ میرے کمرے میں آ جائے اور اُونٹوں کو اُتارنے کا طریقہ بتا دے۔ اُسے کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔" ہیڈ ماسٹر صاحِب یہ کہہ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

طالبِ علموں نے فیصلہ کیا کہ ٹِلّو میاں اور بجّی بھائی ہیڈ ماسٹر صاحِب کے پاس جائیں اور اُنہیں ساری بات بتا دیں۔ تھوڑی ہی دیر میں یہ بات سارے قصبے کو معلوم ہو گئی کہ اِسلامیہ ہائی اِسکول کے لڑکوں ہی نے اونٹ چھت پر چڑھائے تھے اور اب وہ اُنہیں نیچے اُتارنے پر رضامند ہو گئے ہیں۔ اب تو ہجُوم میں اور بھی اِضافہ ہونے لگا۔ ہر شخص یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آخر اُونٹ چھت پر گئے کیسے؟

تھوڑی دیر بعد ہیڈ ماسٹر صاحِب بجّی بھائی اور ٹِلّو میاں کے ہاتھ تھامے اپنے کمرے سے نکلے اور اِعلان کیا "مجھے خوشی ہے کہ ہمارے بچّوں نے سمجھ داری کا مُظاہرہ کرتے ہوئے شرارت ختم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ وعدے کے مُطابق اُنہیں کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔" اِس کے بعد اُنھوں نے اُونٹوں کی طرف اِشارہ کر کے کہا "چلو بچّو، اب اِن بے چاروں کی جان بخش دو۔"

ٹِلّو میاں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر ایک مخصوص اِشارہ کیا۔ اِشارہ کرنا تھا کہ تمام طالبِ علم اپنے کمروں کی طرف دوڑے۔ لوگ حیران کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ تھوڑی دیر گزری تھی کہ سب لڑکے ایک ایک کر کے کمروں سے نکلنے لگے۔ ہر ایک نے اپنے بستر کا گدّا اُٹھایا ہوا تھا۔ انہوں نے گدّوں کو چھت کی دیوار کے ساتھ رکھا اور کچھ اِس ترتیب سے اُنہیں ایک دوسرے پر اور آگے پیچھے جمایا کہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک سیڑھی سی بن گئی۔ گدّوں کی سیڑھی کو دیکھ کر لوگوں کی سمجھ میں آ گیا کہ اُونٹ اُوپر کیسے پہنچے تھے۔ تین چار طالبِ علم اسی سیڑھی کے ذریعے اُوپر پہنچے اور اُونٹوں کو ہانکتے ہوئے نیچے لے آئے۔ سارا مجمع تعجّب کے عالم میں یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔

اُونٹ نیچے آئے تو اُن کو اُونٹ والے کے حوالے کر دیا گیا۔ لوگوں نے زور زور سے تالیاں بجانی شروع کر دیں۔

ہیڈ ماسٹر صاحِب نے ہنستے ہوئے کہا "ہمارے بچّے بہت ذہین ہیں۔ کاش! یہ اپنی ذہانت کا صحیح اِستعمال کریں۔ اُونٹوں کو چھت پر اِس طرح چڑھانے کا خیال بھلا کس کے ذہن میں آ سکتا ہے؟"

اور اُس دن قصبے والے بھی مان گئے کہ چاہے ٹِلّو میاں پڑھائی میں بہت تیز نہ ہوں، شرارت میں بہت تیز ہیں۔

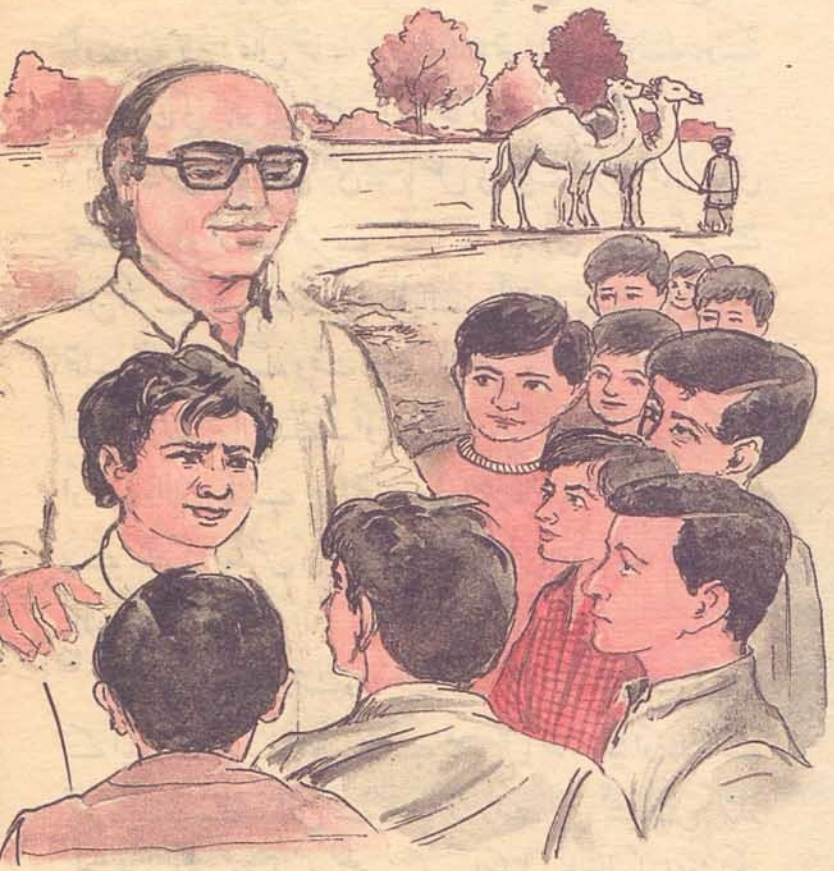

تایا ابّا

ذکیّہ بلگرامی

تایا ابّا ہم سب بہن بھائیوں کو بہت چاہتے تھے۔ ہم چھ بہن بھائی تھے۔ تین بھائی اور تین بہنیں۔ میں اِن سب میں بڑا تھا اور دسویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، اپنے چھوٹے سے گھر میں تایا ابّا کو رہتے دیکھا تھا۔ ہمارے گھر میں صرف تین کمرے تھے جس میں سے ایک تایا ابّا کے پاس تھا۔ باقی دو کمروں میں گھر کے باقی لوگ رہا کرتے تھے۔ ڈرائنگ روم نام کی کوئی چیز ہمارے گھر میں نہ تھی۔

جُوں جُوں میں بڑا ہو رہا تھا، میرے دل میں جگہ کی تنگی کا اِحساس شِدّت پکڑتا جا رہا تھا۔ اکثر اوقات میرے اِسکول کے ساتھی مجھ سے ملنے آتے تو اُنہیں بٹھانے کے لیے کوئی معقول جگہ نہ ہوتی۔ اور یہ سب کچھ محض تایا ابّا کی وجہ سے تھا۔

میں سوچتا کہ اگر تایا ابّا ہمارے گھر میں نہ رہتے ہوتے تو میں اُن کے کمرے کو بیٹھک بنا سکتا تھا۔ صرف میں ہی نہیں، میری چھوٹی بہن شہلا بھی جو آٹھویں جماعت میں تھی، یہی سوچا کرتی تھی۔

تایا ابّا میرے دادا کی پہلی بیوی کے بیٹے تھے۔ اِس طرح ہمارے اور اُن کے بیچ سوتیلے رشتے کی زنجیر تھی۔ تاہم تایا ابّا نے کبھی پیار میں کمی نہ کی۔ اُن کی محبّت اور توجّہ مجھ پر خاص طور سے زیادہ تھی۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ میں گھر میں سب سے بڑا تھا اور میری صورت تایا ابّا سے بہت ملتی تھی۔

میرے ہر اِمتحان اور ہر ٹسٹ کی تفصیل وہ ضرور پوچھا کرتے اور کبھی کبھی نصیحت بھی کیا کرتے۔ اکثر اوقات میں اُن کی باتیں ایک کان سے سُن کر دوسرے کان سے اُڑا دیتا۔

تایا ابّا کی عُمر ساٹھ سال کے قریب تھی۔ اُن کی صِحّت رفتہ رفتہ گر رہی تھی۔ یُوں تو وہ اپنا تمام کام اپنے ہاتھ سے کرنے کے عادی تھے، مگر اُدھر دو تین برسوں سے اُن کی گرتی ہوئی صِحّت نے اُن کی طاقت چھین لی تھی اور اب وہ اپنے چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیئے ہم بھائی بہنوں کو پُکارا کرتے تھے۔ شہلا اور نادیہ ویسے ہی کام چور تھیں۔ میں اکثر پڑھائی کا بہانہ کر دیتا تھا۔ باقی بہن بھائی ابھی کافی چھوٹے تھے۔

اکثر ایسا ہوتا کہ تایا ابّا کے پان دان میں پان ختم ہو جاتے اور وہ پان لانے کے لیے مجھے بازار بھیجتے۔ میں پان لینے جاتا تو راستے میں کوئی دوست مل جاتا۔ تایا ابّا کے رُوپے میری جیب میں رہ جاتے اور میں دو گھنٹے کے بعد واپس آتا تو تایا ابّا میرا

اِنتظار کر رہے ہوتے، مگر میں بے رحمی سے کہہ دیتا "یہ لیجیے تایا ابّا، اپنے روپے۔ پان نہیں ملے۔ اب میں بار بار بازار نہیں جا سکتا۔"

کبھی یوں بھی ہوتا کہ تایا ابّا کی طبیعت خراب ہوتی۔ وہ شہلا، نادیہ یا مجھے پکارتے کہ تھوڑی دیر اُن کا جسم دبا دیں، مگر ہم تینوں ہی کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیتے۔ کبھی تایا ابّا کے بے حد اِصرار پر میں ٹانگیں دبانے بیٹھ جاتا تو اِتنے ہلکے ہاتھوں سے دباتا جیسے ہاتھوں میں دم ہی نہ ہو۔ حال آں کہ میں اِسکول میں کرکٹ کی ٹیم کا کپتان تھا۔ عاجز آ کر تایا ابّا بس کہہ دیتے اور میں خوشی خوشی اُن کے کمرے سے کھسک جاتا۔

اِسی قسم کی بہت سی باتیں ہوتیں اور ہم سب بھائی بہن لُطف لے لے کر ایک دوسرے کو سُناتے رہتے۔ تایا ابّا ہماری اِن حرکتوں کو محسوس تو کرتے مگر مُنہ سے کبھی کچھ نہ کہتے۔ اُنھوں نے ابّو سے کبھی ہماری شِکایت نہ کی تھی۔

تایا ابّا کا کمرا کنارے والا تھا۔ ہم لوگ جان بُوجھ کر اُدھر سے نہ گزرتے کہ وہ کہیں کسی کام سے پکار نہ بیٹھیں۔ گھر میں جگہ کی تنگی تھی۔ اِس کا ذکر ہم امّی سے کرتے تو وہ خاموش ہو جاتیں۔ ابّو سے کچھ کہنے کی ہمارے اندر ہِمّت نہ تھی۔ وہ بہت غصّے والے تھے۔

کچھ دن اور گزرے۔ میں نے میٹرک اچھّے نمبروں سے پاس کر لیا۔ تایا ابّا نے بہت خوشی منائی اور میرے لیے ایک خوب صورت سُوٹ بھی سِلوایا۔ میں سوٹ پہنتا تو خوشی سے میرا انگ انگ ناچنے لگتا۔ اب میں کالج میں آ گیا تھا اور مجھے پڑھنے کے لیے مُناسِب جگہ کی ضرورت تھی، جو ظاہر ہے کہ اِتنے لوگوں میں ممکن نہ تھی۔ جُوں جُوں دن گزر رہے تھے، میری اُلجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ میں سائنس کا طالبِ عِلم تھا اور مجھے بہت محنت کرنی پڑتی تھی۔ ایک دن میں نے امّی سے کہا:

"امّی، مجھے علیحدہ کمرے کی ضرورت ہے۔ میں اِتنے شور اور ہنگامے میں نہیں پڑھ سکتا۔"

"جاوید بیٹا، اِتنے چھوٹے گھر میں تُمھیں علیحدہ کمرا کیوں کر مل سکتا ہے؟" امی نے کہا۔

"آخر تایا ابّا کیوں رہتے ہیں یہاں؟ وہ اپنے گاؤں کیوں نہیں چلے جاتے؟" میں نے جھُنجھلا کر کہا۔

"بُری بات ہے، بیٹے۔ ایسا نہیں کہتے۔ وہ تُمھارے تایا ابّا ہیں اور تم سے بہت مَحبّت کرتے ہیں۔"

میں خاموش ہو گیا۔ مگر ہماری باتیں شاید تایا ابّا نے سُن لی تھیں۔ دوسرے دن اُنھوں نے مجھے پاس بُلایا اور کہا "جاوید بیٹے، میں سوچتا ہوں کہ باہر کے برآمدے میں اپنا پلنگ ڈال لُوں۔ تم اِس کمرے میں آ جاؤ۔ تمھیں پڑھنا لکھنا ہوتا ہے۔ اِتنے شور میں کیا خاک پڑھو گے۔ خدا کرے تم پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بن جاؤ۔ پھر مجھے دوا دارُو کی تکلیف نہیں ہو گی۔"

میں نے تایا ابّا کی تجویز منظور کر لی بلکہ اُسی وقت اُن کا پلنگ اور اُن کی چھوٹی سی چوکی جس پر وہ نماز پڑھتے تھے، برآمدے میں بچھا دی۔ اِس کے بعد میں وہ چھوٹی سی میز بھی باہر لے آیا جس پر اُن کی تسبیح اور کلامِ پاک رکھا ہوتا تھا۔

اب میں علیٰحدہ کمرے میں رہنے لگا۔ آرام سے مُطالعہ کرتا۔ ابّو نے پوچھا کہ تایا ابّا بر آمدے میں کیوں آ گئے تو میں نے کہا کہ یہ سب کچھ اُن ہی کی خواہش پر ہُوا ہے۔ میری بات کی تائید میں تایا ابّا نے کہا "بھائی، کمرے میں میرا دم گھُٹتا تھا۔ یہاں بر آمدے میں کھُلی جگہ ہے، اِس لیے آ گیا ہوں۔"

تایا ابّا کی مہربانیاں جو میری ذات کے لیے خاص تھیں، کم نہ ہوئیں بلکہ اور بڑھ گئیں۔ ایک روز میں نے موقع پا کر امّی سے پُوچھ ہی لیا "امّی، یہ تایا ابّا کا قِصّہ کیا ہے؟ یہ مجھے اِس قدر کیوں چاہتے ہیں؟"

تب امّی نے بتایا "تمہارے تایا ابّا کی بیوی بہُت خراب تھیں۔ وہ لڑ جھگڑ کر علیٰحدہ ہو گئیں۔ اِن کا ایک بیٹا بھی ہے، اختر۔ تمہاری تائی امّاں اختر کو بھی ساتھ لے گئیں۔ تب سے یہ بے چارے ہمارے ساتھ رہتے ہیں۔ اختر تم سے عمر میں بہُت بڑا ہے، لیکن پڑھا نہ لکھا۔ اوباش لڑکوں کی صُحبت میں رہ کر بگڑ گیا ہے۔ تایا ابّا اولاد کی محبّت کو ترسے ہوئے ہیں۔ اِس وجہ سے تم پر اپنی محبّت نچھاور کرتے ہیں۔"

امّی کے بتانے سے مجھے صورتِ حال کا عِلم ہُوا۔ پھر بھی بجائے تایا ابّا کی حالت پر ترس کھانے کے، میں نے دل میں سوچا کہ اگر اِن کا لڑکا خراب ہے تو یہ ہمارے گھر کیوں بس گئے آ کر؟

ایک سال اور خاموشی سے نکل گیا۔ میرے چھوٹے بھائی گڈّو اور آجّی اب اِس قابل تھے کہ گیند بلّا کھیلیں۔ مگر اُن کے لیے گھر میں کوئی جگہ نہ تھی۔ گھر سے باہر بھیجنے کو نہ امّی تیّار تھیں اور نہ ابّو۔ اُن کا خیال تھا، باہر نکل کر بچّے خراب ہو جاتے ہیں۔

اب پھر وہی جگہ کا مسئلہ تھا۔

میری، شہلا اور نادیہ کی رائے تھی کہ اگر تایا ابّا بر آمدے میں نہ ہوتے تو یہ جگہ گڈّو اور آجّی کے کھیلنے کے لیے مُناسب تھی۔

"لیکن تایا ابّا کہاں جائیں؟" نادیہ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"باہر ایک کوٹھڑی بے کار پڑی ہے۔ تایا ابّا آرام سے اُس میں رہ سکتے ہیں۔ اُن کا سامان ہی کتنا ہے" میں نے جواب دیا۔

باہر کی کوٹھڑی بہُت تنگ و تاریک تھی۔ دروازہ کھُلا ہو تو ہَوا اور روشنی آتی تھی اور بند کر دو تو دم گھُٹنے لگتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ تجویز ہم سب بہن بھائیوں نے کھُلے بندوں دوہرانی شروع کر دی۔ امّی نے منع بھی کیا مگر تایا ابّا نہ مانے اور ایک روز خود ہی اُس تاریک کوٹھڑی میں چلے گئے۔

تایا ابّا کا زیادہ تر وقت عِبادت میں گزرتا تھا۔ پانچوں وقت نماز کے بعد وہ ہم سب کے لیئے دُعا مانگا کرتے۔ یہ بات اُنہوں نے مجھ سے کہی نہ تھی۔ میں نے اپنے کانوں سے اُنہیں دُعا مانگتے سُنا تھا۔ در اصل وہ کچھ اُونچا سُنتے تھے۔ اِس وجہ سے اُنہیں اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ اُن کی آواز بلند ہو گئی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اِس قدر گڑ گڑا کر میرے لیے دُعا کرتے کہ میں شرمندہ ہو جاتا۔

جب سے تایا ابّا کوٹھڑی میں گئے تھے، سب بچّے خوش رہنے لگے تھے۔ ابّو نے تایا ابّا سے خود اِس سِلسلے میں بات کی، مگر اُنہوں نے ابّو کو خاموش کر دیا "بھیّا، میرا سامان ہی کتنا ہے۔ میں اِس کوٹھڑی میں بہُت خوش ہوں۔"

تایا ابّا ہم بھائی بہنوں کو چیزیں دیتے رہتے تھے۔ ہم نے بچپن سے اُن کی میز کی دراز میں ایک سیاہ ڈبّا دیکھا تھا، جس میں تالا لگا رہتا تھا۔ کئی بار دل میں کھوج ہوئی کہ کھول کر دیکھیں کہ اِس ڈبّے میں ہے کیا، مگر ایسا موقع نہ مل سکا۔ چابی وہ ہمیشہ اپنے ازار بند میں باندھ کر رکھتے تھے۔

جب تایا ابّا کی طبیعت کچھ زیادہ خراب رہنے لگی تو میں نے دیکھا کہ اکثر وہ اپنا سیاہ ڈبّا کھولتے اور بند کرتے ہیں۔ کبھی موٹے شیشوں والی عینک لگا کر کچھ لکھتے ہیں۔

پھر اچانک ایک دن اُن کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ ابّو نے بہتر سے بہتر ڈاکٹر کو بُلایا۔ امّی نے پرہیز کا پُورا پُورا خیال رکھا

اور ہم سب بہن بھائیوں نے بھی اپنی بساط بھر اُن کی خدمت کی مگر وہ اپنی عمر پوری کر چکے تھے۔ اچانک ایک رات اللہ کو پیارے ہو گئے۔

تایا ابّا کے اِنتقال کی خبر گاؤں میں پہنچ گئی تھی۔ اُن کے سوم کے دِن اُن کا بیٹا اختر آن پہنچا۔ لمبا تڑنگا، بڑی بڑی مُونچھوں والا اختر۔ اُس کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ میں نے اُسے دیکھا تو عجیب سی ناگواری کا اِحساس ہُوا۔ اُس پر تایا ابّا کی موت کا کوئی اثر نہ تھا۔ البتہ اُس نے آتے ہی اِعلان کر دیا کہ یہ مکان فوری طور پر خالی کر دیا جائے۔ اب یہ اُس کی مِلکیّت ہے۔ ہم سب بہن بھائیوں کے مُنہ حیرت سے کُھلے کے کُھلے رہ گئے۔ امّی بھی حیران تھیں۔

تب ابّو نے بتایا کہ یہ مکان تایا ابّا کا تھا۔ اُن کی امّاں اپنے جہیز میں لائی تھیں۔ اِس میں کسی کا حصّہ نہ تھا۔ اِس وجہ سے اب اختر ہی اِس کا حق دار ہے۔

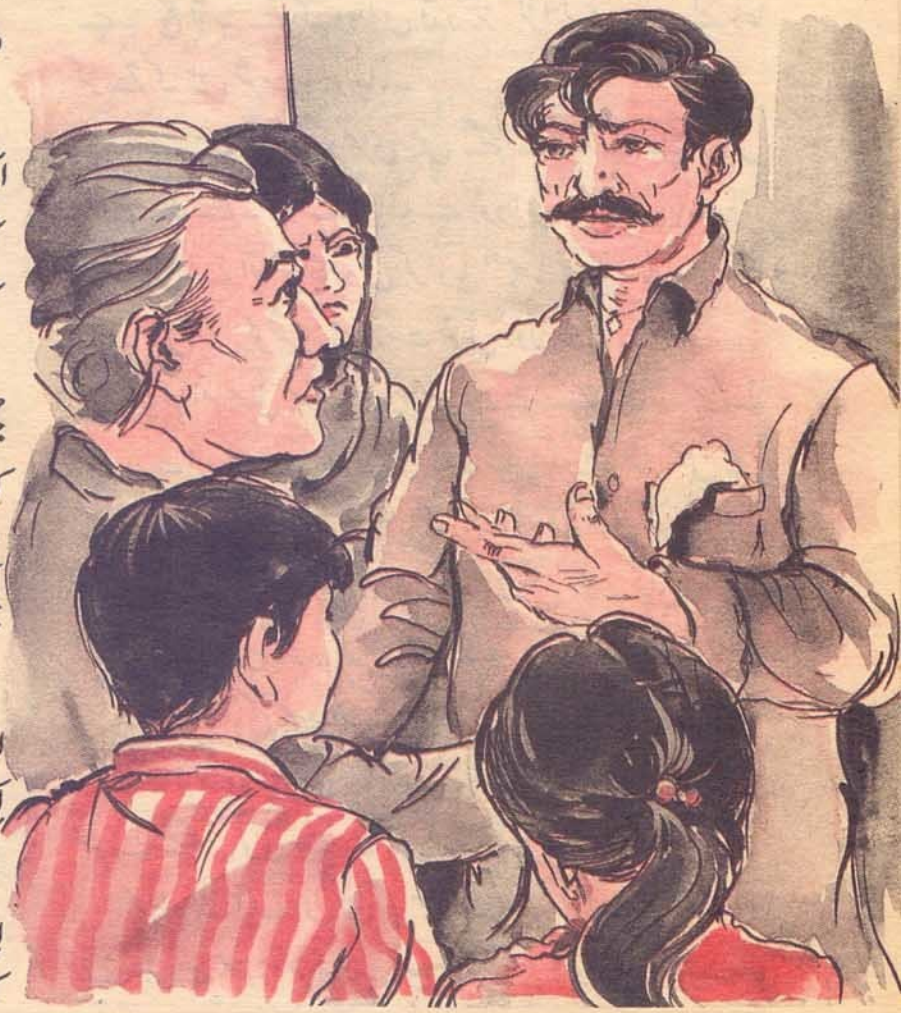

یہ بات ہم سب کے لیے بہت ہی تکلیف دِہ تھی۔ مجھے رہ رہ کر تایا ابّا کے ساتھ اپنے برتاؤ پر پچھتاوا ہو رہا تھا۔

آہ! تایا ابّا، آپ کتنے عظیم تھے!

یہ مکان آپ کا اور صرف آپ کا تھا، پھر بھی آپ نے مُنہ سے کچھ نہ کہا۔ کچھ ظاہر نہ کیا۔ چُپ چاپ کمرا خالی کر کے اُس تاریک کوٹھڑی میں جا پڑے اور وہیں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

اختر دھمکی دے کر جلد ہی واپس چلا گیا۔

ابّو بہت پریشان تھے۔ ہم سب بھی پریشان تھے۔ ابّو کی تنخواہ بہت کم تھی۔ اِس مہنگائی میں کوئی مکان کرائے پر لینا آسان نہ تھا۔ آخر بڑی مشکل سے ابّو نے ایک مکان ڈھونڈا۔ چھوٹے چھوٹے دو کمروں کا تنگ و تاریک مکان۔ اُف! ہم آٹھ لوگ اور اِتنا چھوٹا مکان! کس طرح گزارہ ہو گا اِس گھر میں؟ مگر مجبوری تھی۔ رہ رہ کر یہ گھر اور اِس کا آرام دل میں کھٹک پیدا کر رہا تھا۔

امّی نے روتی آنکھوں سے اسباب باندھنا شروع کیا۔ تایا ابّا کی کوٹھڑی اُسی طرح بند پڑی تھی۔ سامان اُٹھانے کا وقت آیا تو ابّو نے اُن کا سامان بھی نکالا۔ خیال تھا کہ کسی غریب آدمی کو دے دیں گے۔

اور تب ہی اچانک مجھے اُس سیاہ ڈبّے کا خیال آ گیا۔ ڈبّا جُوں کا تُوں موجود تھا مگر چابی کہیں کھو گئی تھی۔ ابّو سے پُوچھ کر میں نے اُس کا تالا توڑ ڈالا۔ ڈبّے میں آبِ زم زم کی شیشی کے عِلاوہ مکان کے کاغذات تھے اور ساتھ ہی وصیّت نامہ بھی جس میں کچھ اور باتوں کے عِلاوہ یہ بھی لِکھا تھا:

"اختر کی غیر ذمّے دارانہ حرکتوں کی وجہ سے میں اُسے اپنی جائداد سے محرُوم کرتا ہُوں اور اپنا یہ مکان جاوید کے نام لِکھ رہا ہوں۔"

"تایا ابّا آپ عظمت کا مینار تھے!" میرے مُنہ سے بے اِختیار نکلا اور چھلکتی آنکھوں کے ساتھ ہم اپنا سامان دوبارہ کھولنے لگے۔

قید سے فرار

محمد یونس حسرت

مُلک کے کونے کونے میں جاسوسوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ لوگ حکومت کے ظلم و ستم سے تنگ آ چکے تھے، لیکن کسی کو اُس کے خلاف کوئی بات زبان پر لانے کا حوصلہ نہ ہوتا تھا۔ جو شامت کا مارا حکومت کے خلاف کوئی بات کہ گزرتا، اُسے گرفتار کر کے سمُندر کے کنارے ایک پہاڑی قید خانے میں ڈال دیا جاتا۔ یہ قید خانہ ایک جہنّم سے کم نہ تھا۔ یہاں قیدیوں کو سخت تکلیفیں دی جاتیں، اُنہیں بڑی بے رحمی سے مارا پیٹا جاتا اور جب کوئی قیدی مر جاتا تو اُس کی لاش سمُندر میں پھینک دی جاتی۔

راحیل کو اِس قید خانے میں آئے نہ جانے کتنے دن، کتنے مہینے، کتنے سال ہو گئے تھے۔ اُسے ٹھیک سے کچھ یاد نہ تھا۔ اُس نے حکومت کے خلاف تو کچھ نہیں کہا تھا لیکن ایک جاسوس سے کسی بات پر اُس کی لڑائی ہو گئی تھی۔ اُس نے راحیل کے خلاف جھوٹی شکایت کر کے اُسے گرفتار کروا دیا تھا۔ راحیل نے اپنی صفائی میں بہت کچھ کہا لیکن کسی نے اُس کی ایک نہ سُنی اور اُسے اُس قید خانے میں ڈال دیا گیا جہاں سے کسی قیدی کو جیتے جی نکلنا نصیب نہ ہوتا تھا۔

اُسے قید خانے کی جس کال کوٹھڑی میں بند کیا گیا تھا، اُس میں ایک قیدی اور بھی تھا۔ اُس کا نام خیری تھا اور اس غریب کو ہر دُوسرے تیسرے روز بُری طرح مارا پیٹا جاتا تھا۔ اِس روز روز کی مار پیٹ کی تاب نہ لا کر ایک روز اُس نے دم توڑ دیا۔ قید خانے کے مُلازموں کے لیے یہ معمولی بات تھی۔ اُنہوں نے خیری کی لاش کو ایک تھیلے میں بند کر دیا اور خود جیلر کو اِطّلاع دینے چلے گئے۔

راحیل سوچنے لگا کہ تھوڑی دیر بعد قید خانے کے مُلازم آئیں گے اور خیری کی لاش کو لے جا کر سمُندر میں پھینک دیں گے، اور وہ اِس بھیانک کال کوٹھڑی میں تنہا رہا جائے گا۔ ہو سکتا ہے کسی دن اُس کا بھی یہی حشر ہو۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اُس کی نظر اُس تھیلے پر پڑی جس میں خیری کی لاش بند تھی اور اِس کے ساتھ ہی اُس کے دماغ میں ایک خیال آیا۔

"میرے اللہ! یہ خیال میرے دماغ میں کیسے آیا؟ کیا تُو نے ہی یہ خیال میرے دل میں ڈالا ہے؟ لوگ مر کر ہی اِس قید خانے کی زندگی سے آزاد ہوتے ہیں، اِس لیے مجھے مرنے والے کی جگہ لے لینی چاہیئے۔"

اپنے فیصلے پر دوبارہ غور کیے بغیر وہ تھیلے پر جُھکا اور اُس میں سے خیری کی لاش نکال کر اُسے اُس جگہ لِٹا دیا جس جگہ وہ خود سویا کرتا تھا۔ خیری کی برف کی طرح سرد پیشانی کو اُس نے آخری بار چُوم کر اُس کا چہرہ دیوار کی طرف کر دیا اور اُوپر کمبل ڈال دیا۔ ایسا اُس نے اِس غرض سے کیا تھا کہ جب سپاہی شام کا کھانا لے کر آئے تو یہی سمجھے کہ راحیل سو رہا ہے۔ اِس کے بعد وہ خود تھیلے کے اندر گھُس گیا۔

تھوڑی دیر بعد اُسے قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ اُس نے اپنا سانس روک لیا اور بالکل لاش کی طرح بے حِس و حرکت لیٹا رہا۔

دروازہ کھُلا تھا۔ ایک مدّھم سی روشنی راحیل کی آنکھوں تک پہنچ رہی تھی۔ تھیلے کے اندر سے اُس نے دو سائے اپنی طرف بڑھتے دیکھے۔ ایک تیسرا آدمی دروازے پر مشعل لیے کھڑا تھا۔ دونوں آدمیوں نے تھیلے کو دونوں سروں سے پکڑ لیا۔

"بڑا بھاری ہے" ایک آدمی نے اُس کا سر اُٹھاتے ہوئے کہا "حالانکہ ہڈّیوں کا ڈھانچا نظر آتا تھا۔"

وہ اُسے چارپائی پر ڈال کر لے گئے۔ اُس نے اپنے بدن کو لکڑی کی طرح اکڑا لیا تھا۔ مشعل کی روشنی میں وہ باہر آئے۔ ایک دم راحیل کو رات کی ٹھنڈی ہوا محسوس ہوئی اور اِس اِحساس سے اُس کے جسم میں مَسرّت کی لہر دوڑ گئی۔

کوئی بیس گز چلنے کے بعد اُنہوں نے چارپائی کو زمین پر رکھ دیا۔ اُن میں سے ایک آدمی چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد راحیل نے اُس کے واپس آنے اور زمین پر کوئی بھاری چیز پھینکنے کی آواز سُنی۔ اِس کے بعد ایک رسّی اُس کے پیروں میں باندھ دی گئی۔

چارپائی ایک مرتبہ پھر اُٹھائی گئی اور وہ لوگ پھر روانہ ہوئے۔ راحیل کو سمُندر کی لہروں کا شور صاف سُنائی دے رہا تھا۔

"بڑا خراب موسم ہے" ایک آدمی نے کہا "آج طوفان ضرور آئے گا۔"

"ہاں، کہیں خیری بے چارہ بھیگ نہ جائے" دوسرے نے کہا اور وہ قہقہے لگانے لگے۔ راحیل اُن کا یہ مذاق سمجھ نہ سکا، لیکن اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

"یہاں ٹھیک رہے گا" اُن میں سے ایک بولا۔

چارپائی نیچے رکھ دی گئی۔ اُنہوں نے تھیلا اُٹھایا اور اُسے اِدھر اُدھر جھلانے لگے۔

"ایک ـــ دو ـــ تین!"

تین کے ساتھ ہی راحیل کو محسوس ہُوا کہ اُسے نیچے پھینک دیا گیا ہے۔ اُس کے نیچے کی طرف جانے کی رفتار اِتنی تیز تھی کہ اُسے اپنا دل برف کی طرح جمتا معلوم ہوا۔ اور پھر وہ دھڑام سے پانی میں جا گرا۔ اُس کے مُنہ سے ایک چیخ نکلی لیکن اُس کے ڈوبنے کے ساتھ ہی وہ چیخ بھی ڈوب گئی۔

راحیل کو سمُندر میں پھینک دیا گیا تھا اور وہ بھاری پتّھر جو ایک رسّی کے ذریعے اُس کے پاؤں سے بندھا ہوا تھا، اُسے سمُندر کی گہرائیوں میں لے جا رہا تھا۔ اگرچہ اُس کا دم گھُٹا جا رہا تھا لیکن ہوش و حواس ابھی قائم تھے۔ اُس نے سانس روکا اور تیزی سے تھیلے کو چیر ڈالا۔ اُس نے پہلے اپنے بازوؤں کو تھیلے سے باہر نکالا اور پھر سر۔ لیکن پیروں سے بندھے ہوئے پتّھر کی وجہ سے وہ نیچے ہی نیچے جا رہا تھا۔

اُس نے اپنے بدن کو کمان کی طرح دوہرا کیا تاکہ اُس کا ہاتھ اُس رسّی تک پہنچ سکے جو اُس کے پاؤں میں بندھی ہوئی تھی۔ آخر جان توڑ کوشش کے بعد وہ اُس رسّی کو عین اُس وقت کھولنے میں کامیاب ہو گیا جب وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ دم گھُٹنے کی وجہ سے وہ ختم ہُوا چاہتا ہے۔ اُس نے پوری طاقت سے اُوپر کی طرف چھلانگ لگائی اور سمُندر کی سطح پر آ گیا۔ بھاری پتّھر اُس تھیلے کو اپنے ساتھ سمُندر کی گہرائیوں میں لے گیا۔

وہ صِرف ایک گہرا سانس لینے کے لیے سمُندر کی سطح پر ٹھہرا اور پھر پانی میں غوطہ مار گیا۔ اُسے ڈر تھا کہ کوئی اُسے دیکھ نہ لے۔ جب وہ دوسری دفعہ پانی کی سطح پر آیا تو وہ اُس جگہ سے کوئی پچاس گز کے فاصلے پر تھا جہاں اُسے سمُندر میں پھینکا گیا تھا۔ اُس نے اُوپر نِگاہ ڈالی۔ آسمان تاریک تھا اور پیچھے دیو قامت پہاڑ ایک خوف ناک اژدہے کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ اپنے وطن میں وہ ایک اچھا تیراک مانا جاتا تھا۔ اُسے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ اِتنی طویل قید نے اُس کی قوّت اور مہارت پر کوئی بُرا اثر نہ ڈالا تھا۔

اُس نے تیرنا شروع کیا اور لہروں کو چیر کر آگے بڑھتا رہا۔ اچانک اُسے محسوس ہُوا کہ آسمان جو پہلے ہی تاریک تھا، اب اور بھی تاریک ہوتا جا رہا ہے اور اُس پر گہرا اور بھاری بادل چھا رہا ہے۔ اُس نے ٹانگ اُوپر اُٹھائی تو اُسے زمین کی موجودگی کا اِحساس ہُوا۔ تب اُسے پتا چلا کہ وہ جس چیز کو زمین سمجھ بیٹھا تھا وہ بڑا سا پتّھر تھا۔ سامنے ہی کچھ فاصلے پر پہاڑیاں تھیں۔ وہ تیرتا ہوا ایک جزیرے تک آ پہنچا تھا۔

وہ اُٹھا اور چند قدم آگے چلا۔ اِس کے بعد خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اُس پتھریلی چٹان پر ہی لیٹ گیا جو اُس وقت اُسے نرم بستر سے بھی زیادہ آرام دِہ معلوم ہو رہی تھی۔ پھر تھکاوٹ سے چُور ہونے کی وجہ سے گہری نیند سو گیا۔

ہُوا اور بارش کے باوجود وہ خاصی دیر تک سویا رہا۔ پھر بجلی کی خوفناک چمک اور گرج نے اُسے جگا دیا۔ یہ گرج اور چمک ایسی ہیبت ناک تھی جیسے آسمانوں کو چیر کر رکھ دے گی۔ اُس سے اِرد گِرد کی تمام جگہ لمحہ بھر کے لیے روشن ہو گئی۔ اِس روشنی میں اُس نے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹے سے جہاز کو دیکھا۔ جہاز ایک لمحے کے لیے پانی کی لہروں میں غائب ہو جاتا اور دوسرے لمحے کسی لہر کے اُوپر نظر آتا۔ بجلی کے ایک اور کوندے کی روشنی میں اُس نے دیکھا کہ جہاز میں پانچ آدمی سوار ہیں جو اُس کے مستُولوں اور رسّوں سے چمٹے ہوئے ہیں۔ پھر اُس نے ایک خوفناک دھماکے کی آواز سُنی، جس کے بعد دل ہلا دینے والی چیخیں بلند ہوئیں۔ ایک اور کوندے کی روشنی میں اُس نے جہاز کو ٹکڑے ٹکڑے ہوتے دیکھا۔ ٹوٹے پھوٹے تختوں اور سامان کے درمیان مایوس چہرے اور دُعاؤں کے لیے آسمان کی طرف اُٹھے ہوئے ہاتھ بھی اُسے دِکھائی دیے۔

آہستہ آہستہ ہوا تھم گئی۔ لمبے چوڑے مٹیالے بادل مغرب کی طرف چلے گئے۔ اُفق پر سُرخی سی چھا گئی۔ سویرا ہو چکا تھا۔ سمُندر پُرسکون ہونا شروع ہو گیا۔ راحیل اپنے دل میں سوچنے لگا، دو تین گھنٹے بعد پہرے دار میری کوٹھڑی میں داخل ہوں گے، وہاں وہ میرے بجائے خیری کی لاش دیکھیں گے اور اُسے پہچان کر مجھے تلاش کریں گے۔ پھر ناکام ہو کر خطرے کا الارم بجا دیں گے۔ وہ اُن آدمیوں سے پُوچھ گچھ کریں گے جنھوں نے مجھے سمُندر میں پھینکا تھا۔ مُسلّح سپاہیوں سے بھری ہوئی کشتیاں فوراً اُس بھاگے ہوئے قیدی کی تلاش میں جائیں گی جس کے مُتعلّق اُن کا خیال ہو گا کہ وہ زیادہ دُور نہیں گیا ہو گا۔ توپ کی آواز پُورے ساحلی علاقے کو خبردار کر دے گی کہ کوئی شخص ایک ننگے بھوکے اور بھگوڑے قیدی کو پناہ نہ دے۔ تمام جاسوسوں اور پولیس کو اِطّلاع کر دی جائے گی۔ تب میرا کیا بنے گا؟ میں کہاں سر چھپاؤں گا، جب سمُندر اور خشکی دونوں طرف سے میرا پیچھا ہو رہا ہو گا؟ اللہ! تُو جانتا ہے، میں نے بڑے دُکھ اُٹھائے ہیں۔ میری مدد کر! مجھ پر رحم کر!"

اور راحیل کے ہاتھ بے اِختیار دُعا کے لیے آسمان کی طرف اُٹھ گئے۔ اِس کے فوراً بعد ہی اُس نے اُفق پر ایک چیز نمودار ہوتے دیکھی۔ یہ ایک جہاز تھا جو اُسی طرف آ رہا تھا۔

"میں تیر کر آدھے گھنٹے میں اُس تک پہنچ سکتا ہوں۔ لیکن ایسا نہ ہو کہ وہ مجھے پہچان لیں اور پولیس کے حوالے کر دیں۔ کیا کروں؟ اُنھیں کیا بتاؤں کہ میں کون ہوں؟ ایسی کیا کہانی گھڑوں جس پر اُنھیں فوراً یقین آ جائے؟ اوہو! میں اُس جہاز کا ملّاح کیوں نہ بن جاؤں جو کل رات تباہ ہو گیا تھا؟

یہ کہتے ہوئے اُس نے تباہ شُدہ جہاز کی طرف نگاہ ڈالی تو حیرت سے اُچھل پڑا۔ ایک چٹان کے اُوپر اُس جہاز کے ملّاحوں

میں سے ایک ملّاح کی ٹوپی پڑی تھی اور قریب ہی اُس بد قسمت جہاز کے تختے تیر رہے تھے۔

راحیل نے فوراً سمندر میں غوطہ لگایا اور تیرتا ہوا ٹوپی تک جا پہنچا۔ ٹوپی اُس نے اپنے سر پر رکھی اور ایک تختے کو پکڑ کر اُس طرف کو تیرنے لگا جس کے متعلق اُس کا خیال تھا کہ جہاز کے قریب جا نکلے گا۔

جہاز نے اپنا راستہ تبدیل کیا اور اُس کی طرف آنے لگا۔ راحیل نے پوری قوّت سے اُس کی طرت تیرنے کی کوشش کی لیکن رات بھر تیرنے سے وہ پہلے ہی نڈھال ہو چکا تھا۔ اُس کے بازو اکڑنے لگے اور اُسے اپنا جسم ہلانا بھی مشکل ہونے لگا۔ پھر ایک بڑی اُونچی لہر آئی۔ اِس لہر کا مُقابلہ کرنے کی طاقت راحیل میں بالکل نہ تھی۔ وہ لہر اُس کے سر پر سے گزری اور اُسے جھاگ سے ڈھانپ گئی۔ پھر اُس نے کچھ دیکھا نہ کچھ سُنا۔

جب اُس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو اپنے آپ کو جہاز کے عرشے پر پایا۔ ایک ملّاح اُس کے پیروں کو کپڑے سے رگڑ رہا تھا۔ ایک اور ملّاح اُس کے مُنہ سے پیالہ لگائے ہوئے تھا اور تیسرا جو شاید اُس جہاز کا کپتان تھا، رحم بھری نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"تم کون ہو؟" کپتان نے اُس سے پوچھا۔

"میں ملّاح ہوں" راحیل نے جواب دیا "کل رات ہمارا جہاز طوفان میں گھر گیا اور اُن چٹانوں سے ٹکرا کر تباہ ہو گیا جو سامنے دکھائی دے رہی ہیں۔ زندگی تھی کہ ایک چٹان سے چمٹنے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن کپتان اور میرے تینوں ساتھی ڈوب گئے۔ میں نے آپ کا جہاز دیکھا تو جان خطرے میں ڈال کر آپ کی طرف آنے کی کوشش کی۔ آپ کا بے حد شکریہ۔ آپ نے میری جان بچالی ہے۔"

"خیر، اب تمہارا کیا کیا جائے؟" جہاز کے کپتان نے پوچھا۔

"جو آپ کے جی میں آئے" راحیل نے کہا "میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں جس جہاز پر مُلازم تھا، وہ ڈوب چکا ہے۔ آپ جب کسی بندر گاہ پر پہنچیں تو وہاں مجھے اُتار دیں۔ میں بہت اچھا ملّاح ہوں۔ مجھے کوئی نہ کوئی کام مل ہی جائے گا۔"

کپتان نے کچھ سوچا اور پھر کہنے لگا "تم اگر زیادہ پیسے نہ مانگو تو ہم تمہیں رکھ لیں گے۔"

"جو آپ دوسروں کو دیتے ہیں، وُہی مجھے دے دیں" راحیل نے کہا۔

"ٹھیک ہے" کپتان بولا۔

عین اُس وقت کسی توپ کے سر ہونے کی آواز آئی۔ ملّاحوں نے حیرانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"پہاڑی قید خانے سے کوئی قیدی بھاگ گیا ہو گا" راحیل نے لاپروائی سے کہا۔

پھر اُس نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے ملّاح سے پُوچھا "آج کیا تاریخ ہے؟"

ملّاح نے اُسے تاریخ بتائی۔

"کون سا مہینا ہے؟"

ملّاح نے حیران ہوتے ہوئے مہینا بتا دیا۔

"کون سا سال ہے؟"

اِس پر ملّاح نے حیران ہو کر کہا "کیا تمہیں خیال نہیں کہ تم کیا سوال پوچھ رہے ہو؟"

"میں کل رات کے طوفان سے ڈر گیا تھا" راحیل نے جواب دیا "اِتنا ڈر گیا تھا، اِتنا ڈر گیا تھا کہ سب کچھ بھول چکا ہوں۔ کچھ بھی یاد نہیں رہا۔ یہ کون سا سال ہے؟"

ملّاح نے اُسے سال بتا دیا اور راحیل اپنے دل میں حساب کرنے لگا۔ اُس نے پہاڑی قید خانے میں ایک نہ دو، پورے اٹھارہ سال گزارے تھے۔ جب وہ قید خانے میں داخل ہوا تو بائیس سال کا تھا اور جب اُسے قید خانے سے آزادی نصیب ہوئی تو اُس کی عُمر چالیس سال ہو چکی تھی ـــــ اُس کی عمر کے بہترین سال پہاڑی قید خانے میں کٹے تھے۔ پھر بھی اُسے کوئی غم نہ تھا۔ اُسے آزادی جیسی انمول نعمت مِل چکی تھی اور اَب ایک نئی دُنیا اُس کی مُنتظر تھی۔

بادشاہ کا فیصلہ

سیّد نظر زیدی

کہتے ہیں، کسی ملک پر ایک نیک دِل بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ اُس کو اپنی رِعایا کی بھلائی کا بہت خیال رہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا امیر، غریب سب عِزّت، اِطمینان اور امن سے زندگی گزاریں۔ نہ کوئی بھوکا ننگا رہے اور نہ کسی کے ساتھ بے اِنصافی ہو۔ بُزرگوں نے کہا ہے کہ کسی ملک کا حاکم اچھّا ہو تو اُس ملک میں ہر طرف بہار آ جاتی ہے۔ چُناں چہ اُس بادشاہ کی اچھّائیوں کی وجہ سے اُس کا ملک ہرا بھرا باغ بن گیا تھا اور اُس باغ میں رہنے والے تمام لوگ عزّت اور اِطمینان کی زندگی گزار رہے تھے۔ خود بادشاہ بھی بہت خوش اور مُطمئن رہتا تھا۔ البتّہ اُس کی زندگی میں یہ کمی ضرور تھی کہ وہ بے اَولاد تھا۔

بادشاہ جب تک جوان رہا، اُسے اولاد کی کمی محسوس نہ ہوئی۔ لیکن قُدرت کے قانون کے مُطابِق جب وہ بوڑھا ہو گیا تو اُسے یہ غم ستانے لگا کہ میرے بعد تخت اور تاج کا وارث کون ہو گا۔

ایک دن وہ یہی سوچ رہا تھا کہ اُس کے وزیر نے ادب سے کہا "سُلطانِ عالی مَقام، یہ خادِم حضُور والا کو کچھ دنوں سے پریشان سا دیکھ رہا ہے۔ اِس کی کیا وجہ ہے؟"

"اے دانا وزیر، اللہ پاک نے ہمیں کوئی بیٹا تو دیا نہیں۔ ہمارے بعد ہمارے تخت پر کون بیٹھے گا؟" بادشاہ نے رنج بھری آواز میں کہا۔

وزیر کچھ دیر سوچتا رہا، پھر بولا۔ "سُلطان کی عُمر دراز ہو۔ اگر صِرف اِس وجہ سے حضُور کے دل پر بوجھ ہے تو اِس کا آسان عِلاج یہ ہے کہ حضورِ والا رِعایا کے بچّوں میں سے کسی ایسے بچّے کو اپنا بیٹا بنا لیں جس میں حکومت کرنے کی خوبیاں نظر آئیں۔"

"بِالکُل ٹھیک" بادشاہ خوش ہو کر بولا "حیرت کی بات ہے، ہمارا خیال اِس طرف کیوں نہ گیا۔ بہرحال، تم آج ہی منادی کرا دو کہ ہم اپنی رعایا کے کسی بچّے کو اپنا بیٹا بنانا چاہتے ہیں۔"

وزیر نے اسی دن بادشاہ کے حکم کے مُطابق ملک بھر میں مُنادی کرادی، لیکن اپنی طرف سے یہ شرط بھی لگادی کہ عقل مند، تن دُرست اور تعلیم یافتہ بچّوں کے والدین ہی اپنے بچّوں کو بادشاہ سلامت کی خدمت میں پیش کریں۔ اِس کے بعد اُس نے شاہی محل کے سامنے کُھلے میدان میں خیمے لگوا دیے اور بادشاہ سے عرض کیا "حضُور، جب بچّے آجائیں تو جو بچّہ اچھا لگے اُسے حضُور اپنا بیٹا بنا کر اُس کی تعلیم و تربیت کا اِنتظام فرما دیں۔ اللہ پاک کی ذات سے اُمّید ہے کہ حضُورِ والا کو اپنا جانشین مل جائے گا۔"

بادشاہ نے کہا "اے دانا وزیر، یہ تدبیر تو بہت عُمدہ ہے، لیکن ہزاروں بچّوں میں سے ایسا بچّہ چھانٹ لینا آسان نہیں جو نیک دل بھی ہو، قابل بھی ہو اور ہمّت اور حوصلے والا بھی ہو۔"

وزیر بولا "حضُور، بچّوں کے درمیان ایسے مُقابلے کرائے جائیں جن سے اُن کی بہادری، قابلیّت اور نیک دِلی ثابت ہو۔ اِن مُقابلوں کے تین دَور ہوں۔ جو بچّہ تیسرے دَور میں سب سے بڑھ جائے، حضُور اُسی کو اپنا بیٹا بنالیں۔"

اُس زمانے میں کرکٹ اور ہاکی وغیرہ کھیل تو تھے نہیں۔ کُشتیاں لڑی جاتی تھیں۔ لمبی دوڑ، گھُڑ دوڑ اور فوجی کرتبوں کے مُقابلے ہوتے تھے۔ بادشاہ کے حکم سے اِنہی مقابلوں کا اِنتظام کرایا گیا۔ اِن کے عِلاوہ ذہنی آزمائش کے مقابلوں کا بھی اِنتظام کیا گیا تھا۔ یہ مقابلے بہت دلچسپ اور شان دار تھے۔ اِن میں دیہات سے آئے ہوئے بچّے بھی حصّہ لے رہے تھے اور شہروں میں رہنے والے بچّے بھی۔ امیروں کے بچّے بھی تھے اور غریبوں کے بچّے بھی۔ یہ مقابلے تقریباً ایک مہینا جاری رہے اور جب اِن کا آخری دَور ختم ہوا تو ہزاروں بچّوں میں سے پچاس بچّے ایسے نکلے جو ہر مقابلے میں کام یاب رہے تھے۔ اِن میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جس کے بارے میں کہا جاسکتا کہ یہ دُوسروں سے کم درجے کا ہے۔

بادشاہ اور وزیر یہ مقابلے خود دیکھتے رہے تھے اور انہیں پوری طرح اِطمینان تھا کہ فیصلہ کرنے میں کسی طرح کی دھاندلی نہیں کی گئی۔ لیکن یہ مُعاملہ پھر بھی طے نہ ہو سکا کہ بادشاہ کس بچّے کو اپنا مُنہ بولا بیٹا بنائے۔ اِتنی کوشش کرنے کے بعد بھی ناکامی ہوئی تو بادشاہ نے وزیر سے کہا "اے دانا وزیر، اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ کیا مقابلوں کا چوتھا دَور شروع کرائیں اور یہ بھی اِعلان کر دیں کہ اِن پچاس بچّوں میں سے جو بچّہ اوّل رہے گا، ہم اُسے اپنا مُنہ بولا بیٹا بنالیں گے اور ہمارے بعد وُہی ملک کا بادشاہ بنے گا؟"

وزیر بولا "حضُور والا، آخری تدبیر تو یہی ہے۔ اگر حضُور اِجازت دیں تو آج ہی مُنادی کرا دوں؟"

بادشاہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر بولا "ہاں، تُم یہ اِعلان کرا دو۔ لیکن ہم چاہتے ہیں کہ یہ آخری مُقابلہ ہم خود کرائیں۔ مُنادی کرانے کے عِلاوہ تم ایک اور کام یہ کرو کہ ہمارے محل کے بڑے کمرے میں ایسی چیزیں سجا دو جو زندگی میں کام آتی ہیں۔ مثال کے طور پر پہننے کے کپڑے، ہمارا تاج، لڑائی میں کام آنے والے ہتھیار، اشرفیوں کی تھیلیاں، کھیلوں کا بہت بڑھیا سامان وغیرہ، اور یہ سب سامان اِس طرح رکھواؤ کہ دیکھنے والے آسانی سے دیکھ سکیں اور اگر کوئی بچّہ اُس میں سے کوئی چیز لینا چاہے تو لے لے۔"

وزیر نے ادب سے سر جُھکا کر کہا "عالی جاہ کے حکم کی تعمیل ہوگی۔ غلام آج ہی یہ کام مُکمّل کرا دے گا۔"

"بس ٹھیک ہے۔ جو پچاس بچّے پہلے تینوں مقابلوں میں اوّل آئے ہیں، اُن تک ہمارا یہ حکم پہنچا دو کہ پرسوں صبح کی نماز کے بعد وہ ایک ایک کر کے بڑے دروازے سے محل کے اندر داخل ہوں اور جو سامان اندر رکھا ہُوا ہے، اُسے دیکھتے ہوئے پچھلے دروازے سے باہر نکل جائیں۔ یہ آخری مُقابلہ ہے۔ اِس میں جو بچّہ سب سے زیادہ سمجھ دار ثابت ہو گا، ہم اُسے اپنا بیٹا بنالیں گے اور ہمارے بعد وُہی ملک کا بادشاہ بنے گا۔"

مُقابلے کے دن وہ سب بچّے جنہوں نے پہلے تینوں مُقابلے جیتے تھے، صبح کی نماز کے بعد محل کے بڑے دروازے

کے سامنے جمع ہو گئے اور آپس میں باتیں کرنے لگے۔ ایک بولا "معلوم ہوتا ہے، بادشاہ سلامت نے یہ معلوم کرنے کے لیے محل میں بڑھیا سامان رکھوایا ہے کہ ہم لوگ اُس میں سے کون کون سی چیزیں پسند کرتے ہیں۔"

ایک اور بچّہ بولا "ہاں، معلوم تو یہی ہوتا ہے۔ ہماری پسند سے بادشاہ سلامت کو یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ کس بچّے کا ذہن کس طرح کا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی نے کوئی ہتھیار پسند کیا تو بادشاہ سلامت جان لیں گے کہ یہ بہت بہادر ہے اور لڑائیوں میں اپنے دُشمنوں کو ہرا سکتا ہے۔"

تیسرا بولا "اور جس نے تاج اور شاہی لباس پسند کیا، اُس کے بارے میں معلوم ہو جائے گا کہ اُس کا مزاج شاہانہ ہے اور یہی بادشاہ کا مُنہ بولا بیٹا بننے کے قابل ہے۔ جس نے کھیلوں کے سامان میں سے کوئی چیز پسند کی، اُسے کھلاڑی سمجھا جائے گا۔"

وہ یہ باتیں کر رہے تھے کہ وزیر آگیا اور اُس نے اُنہیں محل میں داخل ہونے کا اِشارہ کیا۔ بچّے قطار بنا کر اندر داخل ہونے لگے۔ بادشاہ اور وزیر محل کے دوسری طرف پہنچ گئے اور اُن کرسیوں پر بیٹھ گئے جو اُن کے لیے بچھائی گئی تھیں۔

محل میں داخل ہونے والے بچّے ذرا دیر بعد پچھلے دروازے سے باہر آنے لگے۔ سپاہیوں نے اُن سے کہا کہ قطار میں کھڑے ہو جائیں۔ سب بچّوں کے ہاتھوں میں کوئی نہ کوئی چیز تھی، جو وہ محل سے لائے تھے۔ بس ایک بچّہ ایسا تھا جو کوئی چیز نہ لایا تھا۔

جب سب بچّے باہر آگئے تو بادشاہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور بچّوں کے پاس آکر وہ چیزیں دیکھنے لگا جو اُنہوں نے ہاتھوں میں پکڑ رکھی تھیں۔ چلتے چلتے وہ اُس بچّے کے پاس رُکا جس کے ہاتھ میں تلوار تھی اور اُس سے پوچھا "بیٹے، تم نے محل

میں رکھی ہوئی چیزوں میں سے تلوار ہی کیوں پسند کی؟"

"اِس لیے عالی جاہ، کہ اِسی کے ذریعے ملکوں پر حکومت کی جاتی ہے" اُس لڑکے نے غرُور بھری آواز میں کہا اور تلوار نیام سے نکال کر اُس کے دستے کو چوما۔

"بہُت خوب!" بادشاہ نے کہا اور پھر اُس بچّے سے سوال کیا جس کے ہاتھ میں تاج تھا "ہاں بیٹے، تم بتاؤ کہ اِتنی ڈھیر ساری چیزوں میں سے تم نے تاج کیوں پسند کیا؟"

"اِس لیے سُلطانِ عالی، کہ میرے نزدیک یہی سب سے قیمتی چیز ہے۔ جس کے سر پر تاج ہو، وہی ملک پر حکومت کرتا ہے۔" لڑکے نے جواب دیا۔

"ٹھیک، بِالکُل ٹھیک" بادشاہ نے کہا اور آگے بڑھ کر اُس بچّے کے پاس گیا جو قلم اور کتاب لیے ہوئے تھا "اچھا، تو تم نے قلم اور کتاب کو سب سے بڑھیا چیز سمجھا۔ تم بتا سکتے ہو کہ یہ دونوں چیزیں باقی چیزوں کے مُقابلے میں زیادہ اچھّی کیوں ہیں؟"

بچّہ سر اُونچا کر کے اور گردن اکڑا کر بولا:

قلم گوئد کہ مَن شاہِ جہانم

یعنی قلم کہتا ہے کہ میں پوری دُنیا کا بادشاہ ہوں۔ اور عالی جاہ، قلم کی یہ بات بِالکُل ٹھیک ہے۔ اگر تلوار اور قلم کی اچھّائیوں کا مُقابلہ کیا جائے تو قلم کی اچھّائیاں زیادہ ہوں گی۔"

"بِالکُل ٹھیک، بِالکُل ٹھیک" بادشاہ نے کہا اور سب بچّوں کی چیزیں دیکھتا ہُوا اور اُن سے سوال کرتا ہُوا آخر میں اُس بچّے کے پاس گیا جو خالی ہاتھ تھا، اور اُس سے پوچھا "کیوں برخوردار، محل میں رکھی ہوئی قیمتی چیزوں میں سے تمہیں کوئی چیز اچھّی نہ لگی جو خالی ہاتھ باہر نکل آئے؟"

"عالی جاہ، چیزیں تو مجھے بہُت پسند آئیں، لیکن میں نے اُن میں سے کوئی چیز اِس وجہ سے نہیں اُٹھائی کہ حضُور نے ایسا کرنے کی اِجازت نہیں دی تھی۔ بس یہ فرمایا تھا کہ ہم محل کے بڑے دروازے سے اندر داخل ہوں اور پچھلے دروازے سے باہر نکل آئیں۔ ایسی صورت میں اگر میں کوئی چیز اُٹھا لیتا تو یہ چوری ہوتی اور سمجھ دار اور شریف لوگ ایسا گندہ کام کبھی نہیں کرتے۔"

"شاباش بیٹے، شاباش!" بادشاہ نے خوش ہو کر کہا۔ پھر بچّوں کی طرف رُخ کر کے بولا "بچّو، ہم نے یہ معلوم کرنے کے لیے تمہیں محل میں بھیجا تھا کہ تم میں سب سے زیادہ اِیمان دار اور سمجھ دار کون ہے، اور اِس پیارے بیٹے نے ثابت کر دیا کہ اِس میں یہ اچھّائیاں سب سے زیادہ ہیں۔ تم یہ بات اچھّی طرح سمجھ لو کہ اِنسان کی سب سے بڑی قابلیّت اور سب سے بڑی طاقت نیکی اور اِیمان داری ہے۔ بہُت بڑا پہلوان بن جانا، گھوڑا دوڑانے میں مہارت حاصل کرنا، تلوار اور نیزہ چلانے میں کمال حاصل کر لینا اور اِسی طرح کے دوسرے ہُنر سیکھنا بھی بہُت اچھّی بات ہے۔ لیکن جو چیز اِن کمالوں کو اِنسان کے لیے سچ مچ مُفید بناتی ہے، وہ اِیمان داری ہے۔ یہ بات ہم تمہیں ایک مثال کے ذریعے سمجھاتے ہیں۔ فرض کرو ایک آدمی بہُت طاقت وَر، بہُت اچھا گھُڑ سوار اور بہُت بڑا تلوار چلانے والا ہے، لیکن لالچی اور بے ایمان ہے تو اِس صورت میں اُس کی سب اچھّائیاں بے کار ہو جائیں گی۔ اُسے کوئی معمولی سا عُہدہ بھی نہ دے گا۔ سب ڈریں گے کہ معلوم نہیں یہ بے اِیمان ہمیں کب اور کتنا نقصان پہنچا دے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

سب بچّے ایک ساتھ بولے "جی، بالکل ٹھیک ہے۔"

بادشاہ بولا "عزیز بچّو، بے اِیمان آدمی سے مِلنا جُلنا تو ایک طرف، اُس کے تو پڑوس میں بھی نہیں رہنا چاہیئے۔ اور جب یہ بات سچ بلکہ بِالکُل سچ ہے تو تمہیں ہمارا یہ فیصلہ بھی بالکل ٹھیک لگا ہو گا کہ یہ ایماندار لڑکا ہی اِس بات کا حقدار ہے کہ ہم اِسے اپنا مُنہ بولا بیٹا بنا لیں اور ہمارے بعد یہی ہمارے تخت پر بیٹھے؟"

"جی، بِالکُل ٹھیک ہے، بِالکُل ٹھیک ہے" سب بچّوں نے اُونچی آواز میں کہا اور بادشاہ نے آگے بڑھ کر اُس خوش قِسمت بچّے کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

دانائی کی باتیں

سُنہری چڑیا

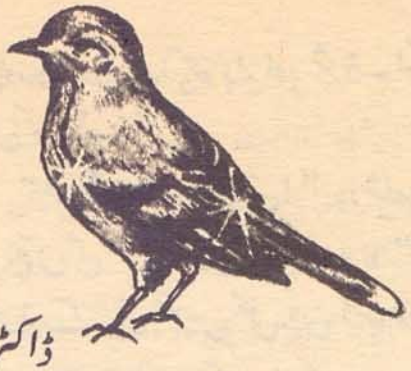

ہتھ کٹی

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر

سُنہری چڑیا نے کہا:

پیارے بچّو، آج کا دن آپ کو کوئی کہانی سُنانے کا دن ہے۔ کہانی کی خوبی یہ ہے کہ وہ سبق آموز بھی ہو اور دلچسپ بھی، یعنی اُس میں کوئی دانائی اور کام کی بات بھی ہو۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ بُری بات کو فوراً ہی مٹا دیا جائے، ورنہ وہ بُری عادت بن جاتی ہے۔ بُری عادت خطرناک بھی ہو سکتی ہے اور اُس کا انجام بُرا بھی ہو سکتا ہے۔ یہ موضوع ہے ہماری آج کی کہانی کا۔

اصل کہانی سُنانے سے پہلے میں آپ کو برطانیہ کے شہنشاہ جارج پنجم کی داستان سُناتی ہوں۔ وہ جب شہزادہ تھا تو بڑا ہی لاڈلا تھا۔ جو چاہتا کرتا۔ کوئی اُسے ٹوکنے یا روکنے کی جسارت نہ کر سکتا تھا۔ اِس طرح وہ کھلنڈرا، ہٹ دھرم اور چور بن گیا۔

بچّو، آپ حیران ہوں گے کہ اِتنا بڑا شہنشاہ چور کیسے بن گیا۔ ہُوا یہ کہ ایک روز شاہی خاندان کے افراد کھانا کھا رہے تھے۔ برتن سونے چاندی کے تھے۔ شہزادے جارج کو سونے کا ایک چمچہ، جس میں ہیرا جڑا ہُوا تھا، پسند آ گیا۔ اگر وہ ملکہ یا بادشاہ یعنی اپنے والدین سے پوچھ کر لے لیتا تو کوئی اُسے منع نہ کرتا۔ لیکن نہ جانے اُس کے جی میں کیا آئی کہ اُس نے وہ چمچہ سب کی نظر بچا کر چُرا لیا۔ لیکن

دیکھنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں

ملکہ نے اپنے لاڈلے شہزادے کی یہ بُری حرکت دیکھ لی۔ لیکن اُس نے اُسے کچھ نہ کہا۔ یہ ملکہ کی غلطی تھی۔ بعد میں بھی اُسے نہ سمجھایا کہ چوری بہت بُری بات ہے۔ اِس سے آدمی بدنام اور مُجرم بن جاتا ہے۔ اِس بات کو معمولی سمجھ کر سب نے ہنسی میں ٹال دیا۔ لیکن بات بڑھتی ہے تو عادت بن جاتی ہے۔ شہزادہ جارج گھر کا چور بن گیا۔ چوری کا مال شاہی محل میں رہتا، اِس لیے بھی کوئی شہزادے کو یہ بُری حرکت کرنے سے منع نہ کرتا۔

شہزادہ جارج بڑا ہوا، بادشاہ بنا، لیکن چوری کی لت جو اُس کی گھُٹّی میں پڑ چکی تھی، نہ چھُٹی۔ اُسے چیزیں خریدنے کا بہت شوق تھا۔ وہ خریداری کے لیے محل سے نکلتا تو مُحافظ اُس کے ساتھ ہوتے۔ شہنشاہ لندن کے سب سے بڑے پلازا میں جاتا اور چیزیں پسند کرتے کرتے ایک آدھ چیز چُپکے سے اپنے کوٹ کی جیب میں ڈال لیتا۔ دکان دار دیکھتے مگر شاہی آداب کی خاطر خاموش رہتے۔ اِس طرح جارج پنجم جس کی سلطنت اِتنی بڑی تھی کہ اُس میں سورج غروب نہ ہوتا تھا، سخت بدنام ہو گیا۔

برطانیہ کے قانون کے مُطابق بادشاہ قانون سے بالاتر ہوتا ہے۔ اِس لیے پولیس اُسے گرفتار کر کے سزا نہیں دِلوا سکتی تھی۔ لیکن اگر اِسلامی ملک کا بادشاہ ہوتا تو چوری کے جُرم میں اُس کا ہاتھ کٹ گیا ہوتا۔

بچّو، اب میں آ کو "ہتھ کٹی" کی کہانی سُناتی ہوں۔ اُس کا نام تو شہناز تھا، مگر پیار سے اُسے رانی کہتے تھے۔ رانی شکل و صورت کی اچھی، مگر سیرت کی بُری تھی۔ امیر والدین کے لاڈ پیار نے اُسے خود سَر بنا دیا تھا۔ ایک روز وہ اپنی ماں اور بہنوں کے ساتھ کپڑا خریدنے گئی۔ ایک دکان سے اُنھوں نے کپڑا خریدا۔ وہاں ریشمی کپڑے کا ایک ٹکڑا پڑا ہوا تھا۔ اُسے دیکھ کر رانی کا دل للچایا۔ شیطان جو انسان کا دشمن اور اُس کے

اندر رہتا ہے، اُس نے رانی سے کہا "اِسے چُرا لو۔" رانی اُس کے بہکاوے میں آگئی۔ اُس نے دکان دار کو دوسری طرف مشغول پایا تو چپکے سے کپڑے کو اپنی چادر میں چھپا لیا۔

گھر واپس پہنچے تو رانی کے ہاتھ میں ریشمی ٹکڑا دیکھ کر ماں نے پوچھا "رانی، یہ کپڑا تم نے کہاں سے لیا؟"

"میں دکان سے چُرا کر لائی ہُوں" رانی نے جواب دیا۔

بات بہت بُری اور خطرناک تھی۔ لیکن سب ہنس دیے۔ کسی نے اُسے جِھڑکا نہ نصیحت ہی کی کہ یہ بُری بات ہے۔ توبہ کرو، اور آیندہ ایسی بُری حرکت نہ کرنا۔ رانی بچّی اور ناسمجھ تھی، لیکن والدین تو بڑے تھے۔ ان کو چاہیئے تھا کہ سرزنش کرتے اور چوری کا کپڑا دکان دار کو واپس کر دیتے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہ کیا۔ اِس سے رانی کو شہ مل گئی اور چیزیں چُرانا اس کی عادت بن گئی۔ یہ کہاوت جتنی مشہور ہے اُتنی سچّی بھی ہے کہ

عادت پڑ جائے تو پھر نہیں جاتی

رانی بیاہ شادی میں جاتی تو موقع پا کر کسی عورت کے پرس سے پیسے نکال لیتی۔ امیر زادی تھی، اِس لیے کسی کو اُس پر اِلزام لگانے کا حوصلہ نہ ہوتا۔ اِس طرح یہ عادت پُختہ ہوتی گئی اور وہ عادی چور بن گئی۔ اِس کے نتیجے میں وہ بدنام بھی ہو گئی۔ جُرم انسان کو بے شرم بنا دیتا ہے۔ وہ رُسوا ہوئی، لیکن یہ عادتِ بد نہ چھوڑی۔

یاد آیا۔ وہ اِسکول میں بھی لڑکیوں کی چیزیں چُرا لیا کرتی تھی۔ دو ایک دفعہ شکایت کرنے پر اُستانیوں نے اُسے خوب ڈانٹا اور اُس کے گھر بھی اِطّلاع کی کہ رانی کو چوری کرنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ لیکن دولت کے نشے میں غافل والدین نے ہیڈ مسٹرس کی شکایت کی بھی پروا نہ کی۔ وہ یہ حقیقت بھول گئے کہ گُناہ کبھی نہ کبھی ظاہر ہو ہی جاتا ہے اور گناہ گار کو اِس کی سزا ضرور ملتی ہے۔ یہ قُدرت کا قانونِ اِنصاف ہے۔

رانی کی عمر سولہ برس ہو گی کہ ایک امیر گھرانے کے لڑکے سے اُس کی منگنی ہو گئی۔ گھر والوں نے کئی دن جشن منایا۔ رانی بھی بہت خوش تھی۔ شادی کی تاریخ مقرر کرنے سے پہلے اس کے والدین اسے لے کر عُمرہ کرنے کے لیے مکّہ مکرّمہ گئے۔ عُمرہ کرنے کے بعد نبیِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی مسجد اور روضۂ مبارک کی زیارت کے لیے مدینے گئے اور وہاں سے فارغ ہو کر جدّہ گئے۔

ایک روز وہ ایک جوہری کی دکان پر زیورات دیکھ رہے تھے کہ رانی نے حسبِ عادت ہیرے کی ایک انگوٹھی چُرا لی۔ اِتّفاق سے جوہری کے ملازم نے دیکھ لیا۔ اُس نے چُپکے سے اپنے مالک کے کان میں یہ بات کہہ دی۔ جب رانی کے والدین زیورات خرید چکے تو جوہری نے رانی سے انگوٹھی واپس کرنے کے لیے کہا۔ چوری اور جھوٹ ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ رانی نے حسبِ عادت اِنکار کر دیا۔ والدین نے بھی بیٹی کی حمایت کی۔ تکرار ہوئی، بات بڑھی۔ انگوٹھی قیمتی تھی۔ جوہری نے پولیس کو اِطّلاع کر دی۔ زنانہ پولیس نے رانی کی تلاشی لی تو اُس کے پاس سے انگوٹھی برآمد ہو گئی۔

سعودی عرب میں اِسلامی قانون نافِذ ہے، اور چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے۔ مُقدّمے کا فیصلہ قاضی فوراً کر دیتا ہے۔ رانی کا جُرم ثابت ہو گیا تو قاضی نے اُس کا بایاں ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔

والدین نے بہت جتن کیے، لیکن ان کی کوئی پیش نہ چلی۔ رانی کا بایاں ہاتھ کٹ گیا۔ وہ تڑپی، روئی اور چِلّائی، پھر بے ہوش ہو گئی۔ ڈاکٹر نے زخم پر دوا لگائی اور اس پر پٹّی باندھی۔ رانی کو ہوش آیا تو اپنا ہاتھ کٹا دیکھ کر زار و قطار رونے لگی۔ اس کے ماں باپ بھی سخت نادِم اور پریشان تھے کہ وطن لوٹ کر لوگوں کو کیا مُنہ دکھائیں گے۔

رانی کو اپنے کیے کی سزا ملی۔ لوگوں میں وہ "ہتھ کٹی" مشہور ہو گئی۔ اس کے منگیتر نے اس کے ساتھ شادی کرنے سے اِنکار کر دیا۔

بچّو، یہ ہوتا ہے بُرے کام کا بُرا انجام۔

شیر اور چوہا

سُنو، ایک دِن کا ہے یہ ماجرا
تھا اِک شیر جنگل میں سویا ہُوا

ہُوا ایک چُوہے کا واں سے گزر
پڑی شیر پہ جُونہی اُس کی نظر

لگا شیر کے مُنہ پہ دُم پھیرنے
تو گھبرا کے انگڑائی لی شیر نے

اُٹھا شیر غصّے میں بپھرا ہُوا
لیا اپنے پنجے میں اُس کو دبا

پکارا یہ چُوہا "خطا بخش دو
مجھے چھوڑ کر تم دُعا میری لو

سلامت یہاں سے جو میں جاؤں گا
تمہارے میں اِک روز کام آؤں گا"

سُنا شیر نے تو بہت ہی ہنسا
کہا "تُو مِرے کام کیا آئے گا؟

حقیر اور ننّھا سا چُوہا ہے تُو
میرے سامنے چیز ہی کیا ہے تُو؟"

تو رحم آ گیا شیر کو اُس گھڑی
کہا "بخش دی جان میں نے تِری"

اور چُوہا وہاں سے روانہ ہُوا
وہیں لیٹ کر شیر پھر سو گیا

پھر اِک دِن شکاری وہاں آ گیا
جُونہی جال میں شیر اُس کے پھنسا

وہ چیخا، وہ دھاڑا، پٹخ کر جو سَر
تو چُوہے کو بھی ہو گئی پھر خبر

کُتر کر شکاری کا چُوہے نے جال
کہا شیر سے یہ ہے میرا کمال

نہیں ہے جہاں میں کوئی بھی حقیر
وہ بہتر ہے جو کہ دہ ہو جس کا ضمیر

تاج انصاری

دماغ لڑاؤ

داؤدی علمی آزمائش

1 - اقوامِ متحدہ کی سرکاری زبانیں کتنی ہیں؟
2 - تُرکی، بلغاریہ اور رُومانیہ کس سمندر کے کنارے آباد ہیں؟
3 - انسان کے جسم میں کتنی ہڈیاں ہوتی ہیں؟
4 - دُنیا کا سب سے تیز بہنے والا دریا کہاں ہے، اور اُس کا نام کیا ہے؟
5 - اِسلام آباد کے اُس مقام کا نام بتایئے جہاں پاکستان آنے والا ہر غیر ملکی سربراہِ مملکت پودا لگاتا ہے؟
6 - اُس ملک کا نام بتایئے جس کا تقریباً چوتھائی حصّہ سطحِ سمندر سے نیچے ہے؟
7 - جناحِ اسٹیڈیم کس شہر میں ہے؟
8 - قائدِ اعظم عجائب گھر کہاں ہے؟
9 - ریاست ہائے مُتحدہ امریکا (یُو ایس اے) میں کتنی ریاستیں ہیں؟
10 - عینک کس نے، کہاں اور کب ایجاد کی؟

ضروری نوٹ: مختصر جوابات لکھ کر بھیجیں۔ سوال لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حل کے ساتھ کوپن اچھی طرح پن اپ کریں۔

پہلا اِنعام (بالکل صحیح حل) 350 روپے کی کتابیں
دوسرا اِنعام (ایک غلطی) 300 روپے کی کتابیں
تیسرا اِنعام (دو غلطیاں) 200 روپے کی کتابیں
چوتھا اِنعام (تین غلطیاں) 150 روپے کی کتابیں

(1) نیوزی لینڈ (2) سرفراز نواز (3) تین مرتبہ 1960,1968,1984 (4) حضرت موسیٰؑ (5) کرومیم (6) ہائیڈرو میٹر (7) دریائے سندھ (8) ہیپی برتھ ڈے ٹُو یُو (9) پاکستان

دماغ لڑاؤ

سرحل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 جنوری ہے۔

پتا ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ شارع بن بادیس لاہور۔

نام _____ عُمر _____

پتا _____

کے شہر فیصل آباد میں (10) کیلی فورنیا۔

ماہ دسمبر میں 30, 30 روپے کی کتابیں انعام میں حاصل کرنے والے دوست اپنے مکمّل پتے جلد از جلد دوبارہ اِرسال کریں۔

بالکُل دُرست حل

اِس ماہ 41 ساتھی تمام سوالوں کے درست جوابات دینے میں کامیاب ہوئے۔ اِن میں سے شروع کے 12 ساتھیوں کو بذریعہ قُرعہ اندازی 30,30 روپے کی کتابیں دی گئی ہیں۔

عبدُالسّلام غوری بھکر۔ بینا افشین مروان۔ فیصل مسعود بٹ فیصل آباد۔ محمد عمار ناصر کمالیہ۔ طلعت شمع سانگھڑ۔ ستار موچی سنجھورو۔ پرنس ملک سرفراز احمد ملتان۔ پیرزادہ مسعود احمد صدیقی اسلام آباد۔ محمد اسماعیل عبدالرحمٰن کراچی۔ صبیحہ مسعود راولپنڈی۔ ثوبیہ بابر راولپنڈی۔ یونس وحید چشتیاں۔

خادم حسین سولنگی سنجھورو۔ فوزیہ راؤ فوزی بھکر۔ نازیہ سیّد نازی بھکر۔ محمد سبطین غازی کمالیہ۔ محمد سلیم شیخ سنجھورو۔ انوار احمد گل کامرہ۔ محمد سلمان شاکر کراچی۔ سمیرا ناصر سمن آباد لاہور۔ جودت مسعود راولپنڈی۔ مریم رفیق میرپور خاص۔ محمد ماجد رضا چشتیاں۔ واصف لطیف چوہدری بہاولپور۔ زینب جبین سانگھڑ۔ بشریٰ بے بی سانگھڑ۔ زاہد شیرازی بھکر۔ خرم شیرازی بھکر۔ شاہد ندیم چشتیاں۔ عرفان یونس ڈنڈوت۔ مدثر حسین کامرہ۔ خدیجہ مسعود راولپنڈی۔ اشفاق احمد راں بھکر۔ مساعد حمید سرگودھا۔ عابد حسین رندھاوا سانگھڑ۔ محمد تنویر انصاری کمالیہ۔ سعدیہ بٹ گوجرانوالہ۔ ذوالفقار حیدر راجپوت سنجھورو۔ محمد شاہد راجپوت سانگھڑ۔ پرنس ایم شبیر سنجھورو۔ زین العابدین سانگھڑ

ایک غلطی والے 46 حل موصول ہوئے۔ اِن میں سے بذریعہ قُرعہ اندازی شُروع کے 12 ساتھیوں کو 25,25 روپے کی کتابیں دِی گئی ہیں۔
وحید اختر نرتوپہ اٹک۔ احمد علی مُبارک لاہور۔ اقبال حسین نواز پشاور۔ اویس مظہر لاہور۔ مہ پارہ فیاض فیصل آباد۔ محمد حسیب الرحمٰن لاہور۔ شہزاد محمود کمالیہ۔ سمیرا دِلاور لاہور۔ نواز احمد رحیم یار خان۔ محمد نعیم طاہر بھکّر۔ نعمان اشرف خان وزیر آباد۔ طاہرہ حنا اِسلام آباد۔
محمد حامد رضا چشتیاں۔ حافظ عبدالمنان حیدر بھکّر۔ ذیشان حسین لاہور۔ شازیہ بتول جہلم۔ محمد شہزاد گل واہ کینٹ۔ محمد علی ارشد سیالکوٹ۔ قندیل ظفر کمالیہ۔ تیمور خان غوری واہ۔ عاصمہ ناصر جہلم۔ اسماء طارق لاہور۔ عمر اعجاز لاہور۔ سہیل گل گلزار علی کراچی۔ خجستہ جبین لاہور۔ عبدالشکور رحیم یار خان۔ علی اجلال حافظ آباد۔ شکیل احمد بھوج میرپور خاص۔ منصور عدنان علی خان پور۔ محمد رضا امین حیدر آباد۔ حسیب اللہ پشاور۔ حلیمہ عزیز ونگری گراں۔ مریم عزیز ونگری گراں۔ محمد عبداللہ خان کنڈی ملتان۔ قاسم علی خان زادہ اٹک۔ محمد یاسر حسن چھوہر شریف۔ اسد جان نواز پشاور۔ صہیب رومی پیر محل۔ فیصل مختار ملتان۔ پرنس عامر محمود طاہر سُکھ پور اوکاڑہ۔ شہزادی نگہت فیصل آباد۔ رمنا فیاض فیصل آباد۔ محمد مالک لاہور۔ سیّد اشعر زیدی اِسلام آباد۔ میمونہ قادر خان ٹیکسلا۔ ظہیر احمد کوٹ عبدالمالک۔

دو غلطی والے 66 حل موصول ہوئے۔ اِن میں سے شُروع کے 10 ساتھیوں کو بذریعہ قُرعہ اندازی 20,20 روپے کی کتابیں دِی گئی ہیں۔
قُدسیہ نصیر پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس لاہور۔ حافظ شاہ ولی اللہ حامد چھوہر شریف۔ سیّد معین الدین راولپنڈی۔ تنویر مسعود لاہور۔ نعمان احمد خان کراچی۔ ذیشان رفیع حیدر آباد۔ عرفان ظفر پاکپتن۔ شاہد قُریشی احمد پور شرقیہ۔ ہما فضل چکوال۔ سعدیہ شہزاد ساہیوال۔
ماریہ نصیر، عفیفہ نصیر، عبدالقیوم گیلانی نیو کیمپس لاہور۔ محمد سُہیل نذیر ہری پور۔ عبداللہ فیصل ہری پور۔ محمد رضوان ایّوب کھاریاں۔ حسن آصف طور لاہور۔ رضوانہ بشیر وزیر آباد۔ نوید خالد لاہور۔ وجیہہ کرن جہلم۔ فخر ریاض صدام ہوتیانہ۔ محمد حماد بن احمد لاہور۔ سلویہ بتول کُندیاں۔ محمد معروف احمد چشتی حویلی لکھا۔ عظمیٰ نورین اوکاڑہ۔ شیر نواز گل ارمڑ پایان پشاور۔ آمنہ غفور اِسلام آباد۔ محمد قاسم صدیقی پیراں غائب۔ فصیحہ ڈار گجرات۔ حمید احمد پھالیہ۔ نائلہ خلیل احمد پھالیہ۔ سیّد حسنین حیدر زیدی بھکّر۔ اِرم فاطمہ سکھّر۔ حافظ ذیشان احمد گوجرانوالہ۔ محمد الیاس چشتی شیرو جدید۔ سیّد محمد علی مشیر رضوی حیدر آباد۔ صائمہ عمر گدّی پٹھان حیدر آباد۔ علی اصغر جدران فیصل آباد۔ محمد اقبال حضرو۔ عنبر شفیق راولپنڈی۔ سُہراب شہید پشاور۔ حافظ محمد افضل قادر کامونکی۔ سیّد محمد اسد بخاری لاہور۔ شہزادہ محمد عمر منہاس لاہور۔ رابعہ بشارت لاہور۔ عاظم شہزاد لاہور۔ عثمان نعیم ضلع کوہاٹ۔ ثناء عامر لاہور۔ شہزین رحمان لاہور کینٹ۔ محمد زُبیر قُریشی احمد پور شرقیہ۔ محمد آصف کامران ڈیرہ اسماعیل خان۔ عرفان الحیٔ حضرو۔ سیّد طٰہٰ فراز حیدر کاظمی لاہور۔ عمران اللہ کلاچی۔ ہارون رشید کھوکھر ڈیرہ اسماعیل خان۔ حسن رضا گردیزی لاہور۔ نور الاسلام حقانی نوشہرہ۔ عفت جہان بتّوں۔ قمر داؤد اِسلام آباد۔ زوہیب وقاص شیخوپورہ۔ عدیل ارشد ساہیوال۔ محمد وقاص اسلم بٹ ککھڑ منڈی۔ محمد نعیم وارثی کراچی۔ قاری جلیل احسن علی تحصیل تلہ گنگ۔ سمیرا اِنعام لاہور۔ سعدیہ شوکت لاہور۔

تین غلطی والے 57 حل موصول ہوئے۔ اِن میں سے بذریعہ قُرعہ اندازی شُروع کے 10 ساتھیوں کو 15,15 روپے کی کتابیں دِی گئی ہیں۔
علی اصغر پڈّا گوجرانوالہ۔ اکرام الحق شیخ ملکہ ہانس۔ تنویر اقبال سرگودھا۔ ذوالفقار علی عاصم ملکہ ہانس۔ راقبہ سُلطان لاہور۔ محمد فاروق منیر لاہور۔ جمشید عالم ٹیکسلا۔ میر راحیل پرویز انور مظفر آباد آزاد کشمیر۔ احتشام احمد خان گوجرانوالہ۔ محمد سعید چھوہر شریف۔
زاہد نثار صادق آباد۔ شعبانی اعوان تونسہ شریف۔ اخلاق احمد ساغر خان کھچی تحصیل عارف والا۔ نقاش سیف اوکاڑہ۔ کاشف نوشاد احمد اِسلام آباد۔ طاہر مسعود لاہور۔ آصف ایّوب جہلم۔ امینہ صالحہ ڈیرہ اسماعیل خان۔ عمران ثناء اللہ فیصل آباد۔ محمد ذیشان نذیر فیصل آباد۔ محمد عرفان شہزاد مردان۔ عمر عطاء نصیر نیازی بھکّر۔ حافظ خرّم رفیع مغل حضرو۔ حماد علی نواز کھمن لاہور۔ محمد سعد انور شور کوٹ۔ محمد مُراد کاٹھیہ کسووال۔ روزینہ خان ڈگری میرپور خاص۔ سعدیہ احمد بھلوال۔ زرّین شاہد راولپنڈی۔ رافعہ الیاس اعوان لاہور۔ یاسر رحمٰن منہاس قلعہ روہتاس۔ سمیر منظور لاہور۔ محمد علی منگلا کالونی جہلم۔ آمنہ ظہیر لاہور۔ احتشام الحق چکوال۔ عظیمہ رشید میرپور آزاد کشمیر۔ زمان خان لاہور۔ عظمت شاہین کراچی۔ محصنہ خلیل میرپور آزاد کشمیر۔ سیّد اعجاز احمد منگووال۔ زاہد صغیر جلال پور بھٹیاں۔ عبدالمنان چیمہ لاہور۔ محمد مجاہد علی خان ملتان۔ امیر مہر حسین پشاور۔ گل وقار خٹک کرک۔ سحر ذوالفقار احمد راولپنڈی۔ سیّد مشراز علی کاظمی سیالکوٹ۔ نادیہ عنایت سیالکوٹ۔ محمد انیس شیخوپورہ۔ زاہد الیاس لاہوری۔ محمد رضوان سرور لاہور۔ آصف متین اِسلام آباد۔ عائشہ عندلیب لاہور۔ سیّد صائمہ دِلدار جھمرہ سٹی۔ محمد سخاوٹ اٹک کینٹ۔ محمد دانش خان نوشہرہ۔ محمد عثمان سلمانی فیصل آباد۔

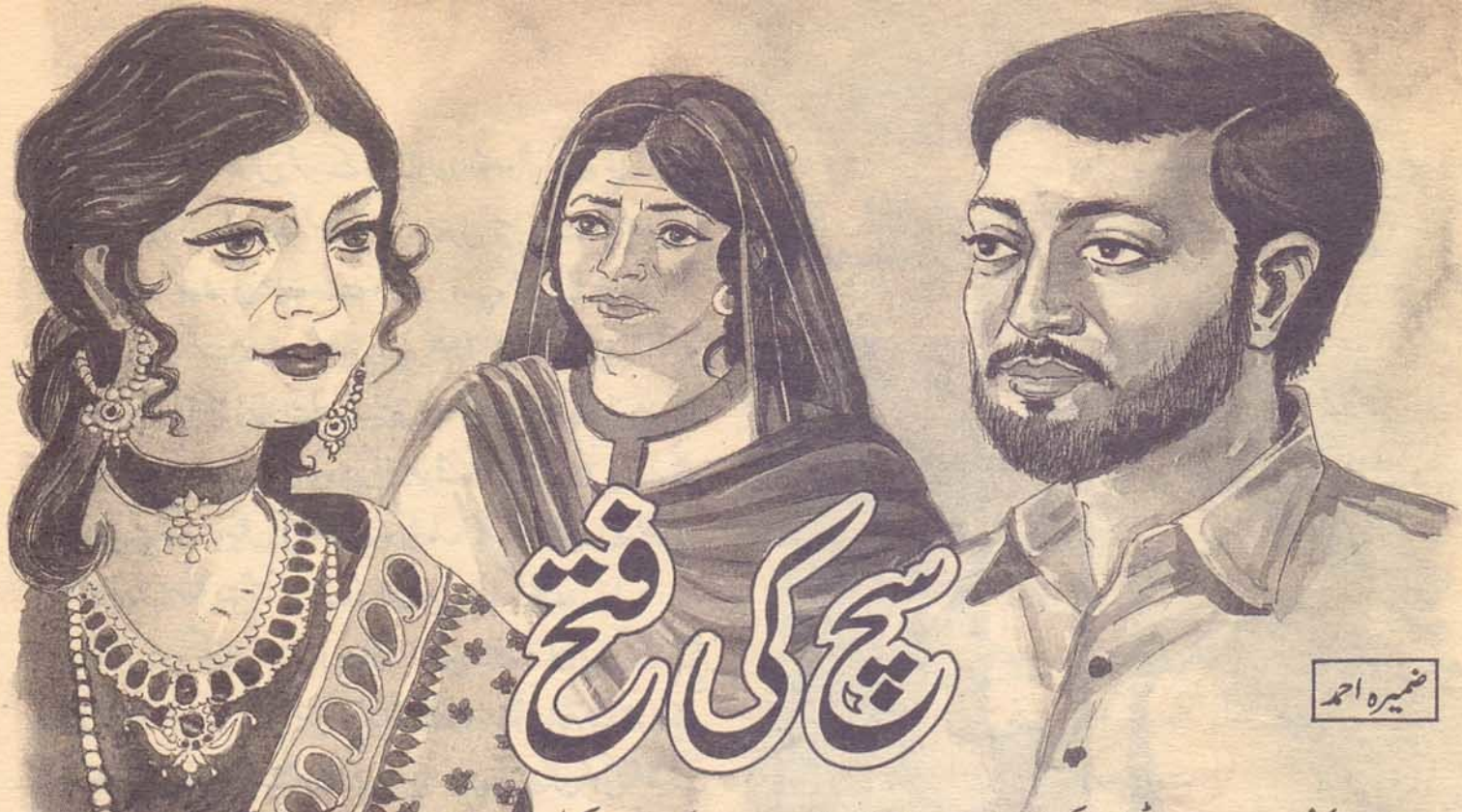

سچ کی فتح

ضمیرہ احمد

ہم دو بہنیں ہیں۔ چھوٹی بہن کراچی میں ہے اور میں لاہور میں رہتی ہُوں۔ میرے میاں ایک سرکاری کام سے دو ماہ کے لیے برطانیہ گئے ہوئے تھے۔ بچّہ ایک فوجی اِسکول میں تعلیم پا رہا تھا۔ میاں کے جانے کے بعد میں گھر میں اکیلی رہ گئی۔ پہلا مہینا جُوں توُں گزار دیا۔ پھر سوچا ایک ماہ کے لیے چھوٹی بہن کے ہاں چلی جاؤں۔ وقت بھی ہنسی خوشی کٹ جائے گا اور اِس عرصے میں میاں بھی واپس آ جائیں گے۔ بہن بھی بڑے دِنوں سے کراچی آنے کے لیے اِصرار کر رہی تھی۔ چُنانچہ میں اُس کے پاس چلی گئی۔ اُس کی شادی کے بعد اُس کے گھر جانے کا یہ میرا پہلا اِتّفاق تھا۔

میرے بہنوئی مذہبی خیالات کے اِنسان ہیں۔ نماز روزے کی سختی سے پابندی کرتے ہیں۔ بڑی بااُصول اور باقاعدہ زندگی گزارتے ہیں۔ میری بہن بہت لاپرواتھی۔ اُس کی طبیعت میں سنجیدگی نام کو نہ تھی۔ اُسے جدید لباس، نئے نئے کھانے پکانے اور تفریح کا بڑا شوق تھا۔ چُنانچہ کراچی پہنچ کر میں نے محسوس کیا کہ اِن میاں بیوی میں وہ بے تکلّفی اور لگاؤ نہیں ہے جو ایک مثالی میاں بیوی میں ہونا چاہیئے۔ بلکہ مجھے اُن کے تعلّقات کچھ کشیدہ نظر آئے۔

اُن کے گھر میں ایک اَدھیڑ عُمر کا مُلازم تھا جو میرے بہنوئی کے پاس پچھلے دس برس سے کام کر رہا تھا۔ اُنہیں اُس پر بڑا اِعتماد تھا۔ وہ اپنا ہر ذاتی کام، روپے کا لین دین، گھر کی ضروریات کی خرید و فروخت، غرض سبھی کام اُس سے کراتے تھے۔ وہ بڑا خوش اخلاق اور محنتی تھا۔ سارا دن کام میں مصروف رہتا۔ گھر کا ہر طرح خیال رکھتا۔ لیکن میری بہن اُس سے خوش نہ تھی، کیوں کہ وہ صاحِب کو گھر کے اِخراجات کی ایک ایک رپورٹ دیتا تھا۔ میری بہن چاہتی تھی کہ گھر میں کوئی ایسا مُلازِم ہو جس کی ہمدردیاں شوہر کی بجائے اُس کے ساتھ ہوں۔ اِس لیے وہ اُسے اکثر جِھڑکتی اور اُس کے کاموں میں عیب نکالتی رہتی تھی۔

ایک دن میری بہن کی ایک سہیلی اُس سے ملنے آئی۔ ہم کافی دیر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ بیٹھے بیٹھے میں اُکتا گئی تو اُٹھ کر ٹہلنے لگی۔ میری بہن اور اُس کی سہیلی بدستور باتیں کرتی اور قہقہے لگاتی رہیں۔ اِسی دوران مجھے اپنی بہن کا یہ فِقرہ سُنائی دیا "تُم فِکر نہ کرو۔ اِسے تو میں دُودھ کی مکّھی کی طرح نکال باہر کروں گی۔ تم اُسے روک لو۔ پہلی تک میں اُسے ضرور رکھ لوں گی۔" اِس کے بعد چائے آ گئی اور میرے ذہن سے دُودھ کی مکّھی والی بات نکل گئی۔

تیسرے دن صبح ہم ناشتے کی میز پر بیٹھے تھے۔ میری بہن

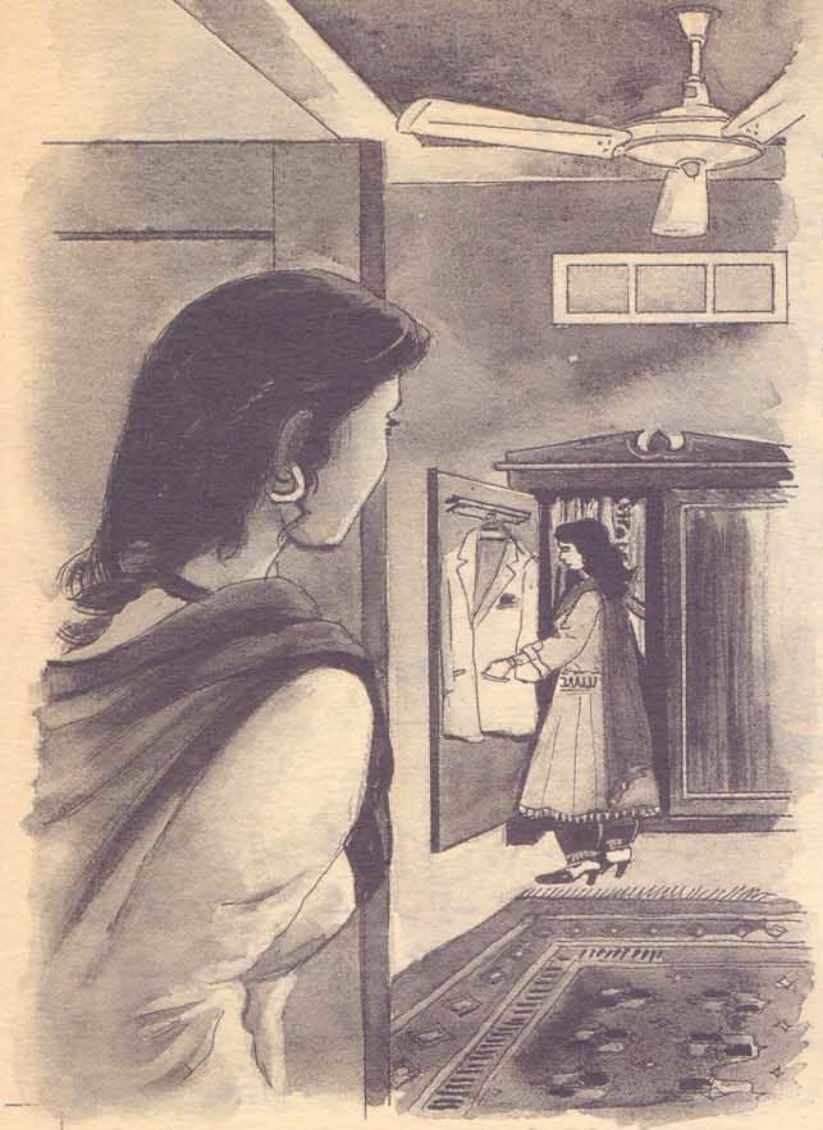

کے میاں لباس تبدیل کر کے آئے اور خاموشی سے چائے پینے لگے۔ تھوڑی دیر بعد اُنھوں نے میری بہن سے پُوچھا "تم نے میرے کوٹ کی جیب سے دو سو روپے نکالے ہیں؟"

یہ سُن کر میری بہن نے فوراً جواب دیا "نہیں تو۔ میں آپ کی اِجازت کے بغیر ایسا کیوں کرتی؟" میرے بہنوئی نے غور سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ اُس نے بھی آنکھیں پھاڑ کر میاں کی طرف دیکھا۔ پھر دونوں نے نظریں جُھکالیں۔ بہنوئی ناشتا کر کے دُکان پر چلے گئے۔

شام کو وہ گھر آئے تو بڑے خوش تھے۔ وہ روزانہ پانچ دس مِنٹ میرے پاس ضرور بیٹھتے تھے اور باتوں باتوں میں ایک آدھ مرتبہ یہ ضرور پوچھتے تھے کہ بہن، آپ کو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں۔ آج بھی وہ حسبِ معمول آئے اور بتایا کہ آج اُنہیں ایک سودے میں دس ہزار روپے کا منافع ہُوا ہے۔ اُس روز وہ ہم سب کو کِلفٹن لے گئے اور ہم دیر تک سمُندر کے کنارے تفریح کرتے رہے۔ وہ دو سو روپوں والی بات آئی گئی ہو گئی۔

کئی دن گزر گئے۔ ایک روز رات کو میں عِشا کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تو باہر برآمدے میں کسی کے قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ میرے بہنوئی تھوڑی دیر پہلے دُکان سے آئے تھے اور لباس تبدیل کر کے مسجد میں نماز ادا کرنے گئے تھے۔ میں نے اُٹھ کر کواڑ کھولے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ میری بہن بِلّی کے سے قدم اُٹھاتی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے آس پاس دیکھتی ہوئی اپنے میاں کے کمرے میں داخل ہُوئی۔ پھر کپڑوں والی الماری کھول کر اُس نے میاں کے کوٹ کی جیب سے کچھ نوٹ نکالے اور اُلٹے قدموں واپس باہر آگئی۔ میں فوراً ایک طرف ہٹ گئی اور دروازہ آہستہ سے بند کر لیا۔

دوسری صبح میرے بہنوئی نے بتایا کہ آج پھر اُن کی جیب سے چار سو روپے چوری ہو گئے ہیں۔ اُنھوں نے بیوی اور مُلازِم سے رُوپوں کے مُتعلّق دریافت کیا تو میری بہن نے بڑی دِیدہ دِلیری سے کہا "آپ جس وقت باتھ رُوم میں گئے تھے تو میں نے مُلازِم کو آپ کے کوٹ کی جیب میں سے روپے نکالتے دیکھا تھا۔ میں نے اُسے کچھ نہیں کہا۔ آپ کا چہیتا جو ہے"۔

یہ سُن کر مُلازِم پر گویا بجلی سی گری۔ اُس نے کہا "صاحِب، یہ جھوٹ ہے۔ میں آپ کے کمرے میں گیا ضرور تھا لیکن مجھے روپوں کے مُتعلّق کچھ عِلم نہیں۔ صاحِب، میں قُرآن شریف اُٹھانے کے لیے تیّار ہوں۔"

قرآن شریف کا نام سُن کر میرے بہنوئی بھڑک اُٹھے "نمک حرام! اپنے جھوٹ اور چوری پر پردہ ڈالنے کے لیے خدا کے پاک کلام کو درمیان میں لا رہے ہو" یہ کہتے ہوئے اُنھوں نے اُس پر مُکّوں اور گھونسوں کی بارش کر دی اور بولے "میں ابھی تجھے پولیس کے حوالے کرتا ہوں۔"

یہ منظر دیکھ کر میرا دِل کانپ اُٹھا۔ میری بہن اُسے پِٹتے

دیکھ کر لُطف اندوز ہو رہی تھی، اور میں سخت اُلجھن میں پھنسی ہوئی تھی۔ کبھی اپنی بہن، کبھی بہنوئی اور کبھی مُلازِم کو دیکھتی جس کے مُنہ سے خون بہ رہا تھا۔ اُس وقت مجھے اپنی بہن کا چہرہ بڑا بھیانک نظر آیا۔ مجھے اگرچہ اُس سے نفرت ہو گئی تھی لیکن بہرحال وہ میری بہن تھی۔ میں ایک دوراہے پر کھڑی تھی۔ ایک طرف بہن کی عِزّت اور اُس کی گھریلُو زندگی کا سُکھ چَین تھا، دوسری طرف ایک بے گُناہ اِنسان پر ظُلم و زیادتی کا خیال مجھے لرزائے دے رہا تھا۔

چند منٹ کی ذہنی کش مکش کے بعد میرے ضمیر نے گویا مجھے جھنجھوڑ کر اپنا فیصلہ سُنا دیا کہ اگر تُو نے سچّائی سے مُنہ موڑا تو اِس وقت نہ سہی، قیامت کے روز تیرا چہرہ سیاہ ہو گا۔ اِس خیال سے میں لرز اُٹھی اور بہنوئی کے سامنے اپنی بہن کی مکّاری کا سارا کچّا چِٹھا کھول دیا۔ بہنوئی چند مِنٹوں کے لیے سکتے میں آ گئے۔ اُنہوں نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ صرف اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ اِس کے بعد وہ گردن جُھکائے چُپ چاپ اپنے کمرے میں چلے گئے۔

اُنہیں اِس بات کا اِتنا صدمہ ہُوا کہ تھوڑی ہی دیر بعد اُنہیں تیز بخار چڑھا اور چھ روز تک بے ہوشی طاری رہی۔ دو ہفتے بعد وہ قدرے صِحّت یاب ہوئے۔ اِس دوران میں میرے میاں ولایت سے واپس آ چکے تھے اور ہم واپس لاہور جانے کی تیّاری کر رہے تھے۔ میرے بہنوئی نے میری بہن سے کہا کہ وہ بھی ہمارے ساتھ اپنے میکے چلی جائے۔ ہم نے دبی دبی زبان میں اُنہیں اپنی بیوی کو مُعاف کرنے کی درخواست کی لیکن وہ ایسی کوئی بات سُننے کے لیے تیّار نہ تھے۔ مجبوراً میں بہن کو لے کر لاہور آ گئی۔

دو سال میری بہن میکے میں بیٹھی رہی۔ اب اُسے اپنی بھیانک غلطی کا اِحساس ہو چکا تھا۔ اُس نے اَن گِنت خط اپنے میاں کو لکھے لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ ایک سال میں اُس کی حالت اِتنی بدل گئی تھی کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر رونے لگتی تھی۔ بُزرگوں کے مزاروں پر جا کر دُعائیں مانگتی، غریبوں کو کھانا کھلاتی، یتیموں اور بیواؤں میں کپڑے اور روپے تقسیم کرتی۔ اُس نے اپنا سارا زیور بیچ کر گاؤں کی ایک کچّی مسجد کا صحن پُختہ کرایا، حوض اور غسل خانے بنوائے۔ وہ باقاعدگی سے نماز ادا کرتی اور صبح شام قرآنِ حکیم کی تِلاوت کرتی۔

میں نے اِن دو سالوں میں اپنے بہنوئی کو پانچ چھ خط لکھے تھے جن میں اُن سے درخواست کی تھی کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی خطا معاف کر دیتا ہے۔ اُنہیں بھی درگُزر سے کام لے کر اپنی بیوی کو ایک موقع اور دینا چاہیئے۔ لیکن اُنہوں نے میرے کسی خط کا جواب نہ دیا تھا۔ میرے والِدین زبان سے تو کچھ نہ کہتے تھے لیکن اُن کا خیال تھا کہ اپنی بہن کی خوشیوں میں آگ لگانے والی میں ہی ہوں۔ اگرچہ میرا ضمیر مُطمئن تھا لیکن اِس بات کا میرے ذہن پر بھی بڑا بوجھ تھا۔

آخر میں نے اپنے میاں سے مشورہ کر کے یہ فیصلہ کیا کہ ہم دونوں کراچی جا کر ایک اور کوشش کریں اور میرے والِدین بھی ہمراہ چلیں۔ میری ضعیف امّی تو یہاں تک کہ رہی تھیں کہ میں اپنے بیٹے کے پاؤں پکڑ لُوں گی۔ وہ میری بات ضرور مان جائے گا۔ لیکن ہم سب دل ہی دل میں خوف زدہ تھے، کیوں کہ میرے بہنوئی نیک اِنسان ہونے کے ساتھ ساتھ اُصولوں کے مُعاملے میں بڑے سخت تھے۔

ہم صبح سویرے اِسٹیشن جانے کے لیے گھر سے باہر نکلے ہی تھے کہ ایک اَدھیڑ عُمر شخص ہمارے گھر کی طرف آتا دکھائی دیا۔ قریب آیا تو میں اُسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ یہ میرے بہنوئی کا وہی مُلازِم تھا۔ میری بہن بھی میرے قریب کھڑی تھی۔ اُس نے ہم سب کو سلام کیا، پھر میری بہن سے بولا "بی بی جی، صاحِب نے مجھے آپ کو لانے کے لیے بھیجا ہے۔"

یہ سُن کر میری بہن اور والِدین کے چہروں پر خوشی کی جو لہر نظر آئی وہ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی۔ بے شک اللہ تعالیٰ سچّائی کی لاج رکھتا ہے اور حق گوئی کے نتیجے میں ہونے والے کسی نُقصان کی بھرپُور تلافی فرما کر سچ کی عظمت کو زندہ رکھتا ہے۔

آیئے مسکرائیں

ضیا: ٹینس کے بارے میں مَیں آپ سے زیادہ جانتا ہوں۔
رشید: اچھا، تو یہ بتایئے کہ ٹینس کے نیٹ میں کتنے سُوراخ ہوتے ہیں؟ (محمّد احمد، ساہیوال)

شکیل: ٹرین میں سفر کر رہے ہوں تو کس طرف مُنہ کر کے نماز پڑھنا چاہیئے؟
جمیل: جِدھر سامان رکھا ہو۔
(شفیق الرّحمٰن صِدّیقی، حیدر آباد)

امّی نے راشد سے کہا "مُنّی نے آپ کی شکایت کی ہے کہ آپ نے کل اُس کے ساتھ بدتمیزی کی تھی۔ اگر آپ معذرت نہیں کریں گے تو میں آپ کے ساتھ کُٹّی کر لوں گی۔"
راشد نے مُنّی کو بُلایا اور کہا "کل میں نے تم سے یہی کہا تھا نا کہ تم جہنّم میں جاؤ؟"
مُنّی بولی "ہاں، آپ نے یہی کہا تھا۔"
"اچھا تو اب میں تم سے کہتا ہوں کہ جہنّم میں مت جاؤ" راشد نے کہا۔ (سلیم الرّحمٰن، دستگیر سوسائٹی کراچی)

ننھّا سلیم اِسکول سے واپس آیا تو اُس کی ایک آنکھ سُوجی ہوئی تھی۔ ماں نے پوچھا تو اُس نے بتایا کہ اِسکول میں رحیم سے لڑائی ہو گئی تھی۔ اُس نے میری آنکھ پر مُکّا مار دیا۔
ماں نے کہا "لڑائی جھگڑا بُری بات ہے۔ کل تم اُس کے لیے کیک لے جانا اور صُلح صفائی کر لینا۔"
دوسرے دن سلیم اِسکول سے گھر آیا تو اُس کی دوسری آنکھ بھی سُوجی ہُوئی تھی۔ ماں نے حیرت سے پوچھا "آج کیا ہُوا؟"
"اب وہ ایک اور کیک مانگتا ہے" سلیم نے مُنہ بسُورتے ہوئے کہا۔ (محمّد صِدّیق، اوکاڑا)

اسلم (جمال سے): حبیب نے لطیفہ سُنایا تو تم ہنسے کیوں نہیں؟ لطیفہ تو بہت اچھا تھا۔
جمال: آج کل میری حبیب سے بول چال بند ہے۔ گھر جا کر ہنس لوں گا۔" (شوکت اِعجاز، گارڈن ٹاؤن لاہور)۔

ایک لیڈر اپنی تقریر میں بار بار غلطی اور حماقت کے الفاظ اِستعمال کر رہا تھا۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے پُوچھا "جناب، غلطی اور حماقت میں کیا فرق ہے؟"
لیڈر بولا "اگر آپ بھُولے سے اپنے پُرانے جُوتے کی بجائے کسی کا نیا جُوتا پہن لیں تو اِسے غلطی کہتے ہیں، اور اگر بھُولے سے اپنے نئے جُوتے کے بجائے کسی کا پُرانا جُوتا پہن لیں، تو اِسے حماقت کہیں گے۔" (صائمہ شہزاد، کوئٹہ)

ایک شخص دریا کے کنارے کھڑا آئینے سے پانی پر عکس ڈال رہا تھا۔ اُدھر سے ایک دیہاتی گزرا۔ اُس نے پوچھا "یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"
اُس شخص نے جواب دیا "مچھلیاں پکڑ رہا ہوں۔ اگر تم مجھے دس روپے دو تو میں تمہیں بھی یہ طریقہ بتا دوں گا۔"
دیہاتی نے اُسے دس روپے دیے اور بولا "اب بتایئے، آپ آئینے سے کس طرح مچھلیاں پکڑتے ہیں۔"
وہ شخص بولا "میں آئینے کا عکس دریا پر ڈالتا ہُوں تو مچھلیوں کی آنکھیں چُندھیا جاتی ہیں اور وہ گھبرا کر اُوپر آجاتی ہیں۔ میں اُنہیں آسانی سے پکڑ لیتا ہوں۔"
"اچھا!" دیہاتی خوش ہو کر بولا "آپ نے آج کتنی مچھلیاں پکڑی ہیں؟"
"تم پانچویں مچھلی ہو!" اُس شخص نے اِطمینان سے جواب دیا۔ (ایس سسٹرز، صادق کالونی بہاول پور)

جِم کاربٹ / ترجمہ: میاں توصیف عاصم

آدم خور شیرنی

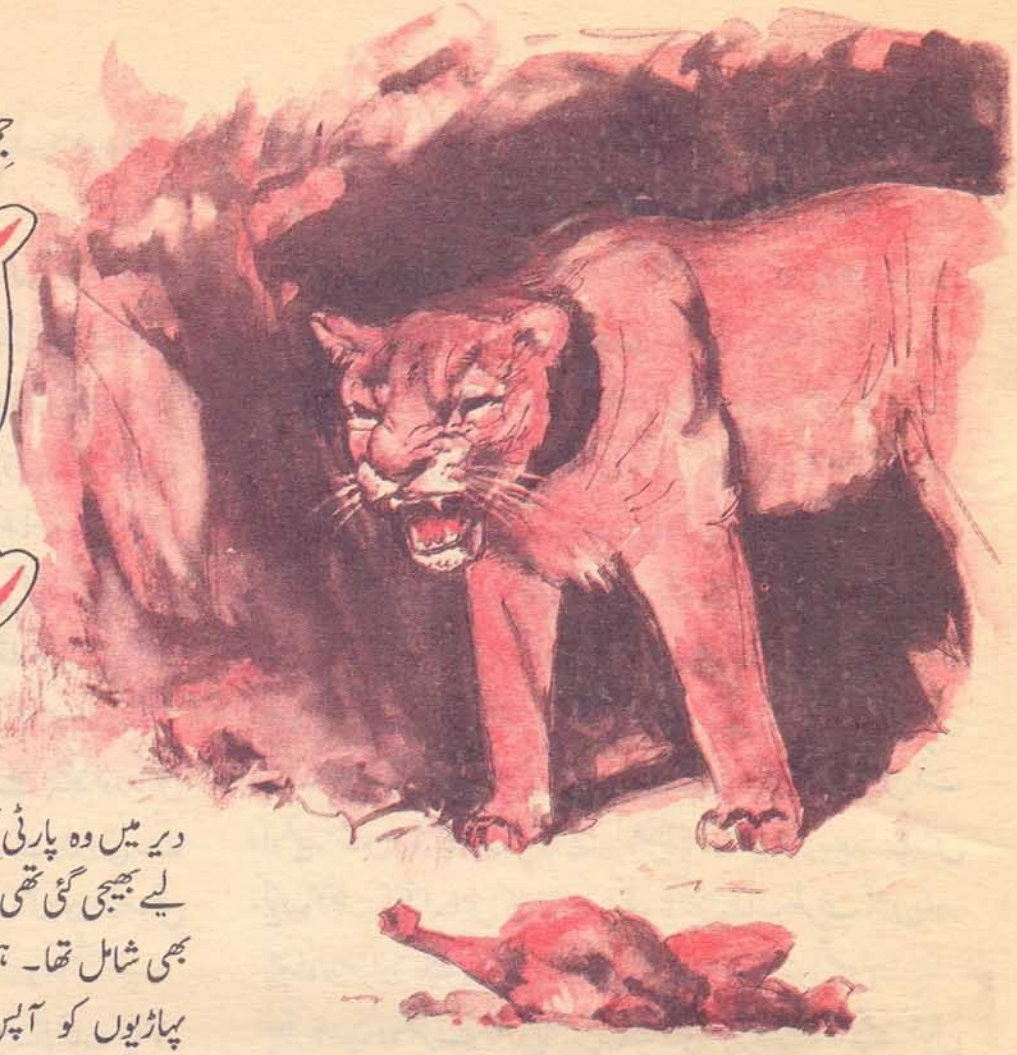

ہندوستان کے ایک گاؤں تلا کوٹ ضلع الموڑہ میں ایک آدم خور شیر نے تباہی مچا رکھی تھی۔ ڈپٹی کمشنر خاصا پریشان تھا۔ لیکن جب مَیں نے آدم خور کو ختم کرنے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں تو اُس نے بڑی مَسرّت کا اِظہار کیا اور گاؤں کے پٹواری کے ذریعے میری آمد کی اِطّلاع گاؤں بھیج دی۔

پٹواری ابھی گاؤں سے دس میل دُور ہی تھا کہ آدم خور نے 4 اپریل کو ایک اور لڑکا مار ڈالا۔ پٹواری اُسی شام تلا کوٹ پہنچ گیا تھا۔ 5 اپریل کو اسی گاؤں میں ایک عورت بھی آدم خور کا شِکار ہو گئی۔ پٹواری چُوں کہ میرا مُنتظر تھا اِس لیے اُس نے عورت کی لاش کو محفوظ رکھنے کے لیے 30 آدمیوں کی ایک پارٹی اس مقام پر بھیج دی جہاں شیر نے اُس عورت پر حملہ کیا تھا۔

مَیں گاؤں کی سمت جاتا ہوا گھنے جنگل سے گزر کر ایک ندی کے کنارے پُہنچا۔ اُس ندی کو میں نے اُن بڑے بڑے پتّھروں کی مدد سے پار کیا جو اُس میں ایک ایک فُٹ کے فاصلے پر رکھ دیئے گئے تھے۔ نمبردار نے میرا اِستقبال کیا اور تھوڑی دیر میں وہ پارٹی بھی پہنچ گئی جو عورت کی لاش کی حفاظت کے لیے بھیجی گئی تھی۔ اِس پارٹی میں اُس عورت کا سترہ سالہ لڑکا بھی شامل تھا۔ ہم اب ایک بلند راستے پر چل رہے تھے جو دو پہاڑیوں کو آپس میں ملاتا تھا اور جِس کے دونوں جانب وادیاں تھیں۔ یہ واقعہ دائیں جانب کی وادی میں پیش آیا تھا۔ وادی لمبی لمبی گھنی گھاس اور درختوں سے بھری ہوئی تھی۔ لڑکے نے اُنگلی کے اِشارے سے بتایا کہ اس بلند مقام سے ایک ہزار گز کے فاصلے پر اور تقریباً ڈیڑھ ہزار گز نیچے یہ حادثہ پیش آیا تھا اور اس وقت اس کی ماں وادی میں دوسری عورتوں کے ہمراہ گھاس کاٹ رہی تھی۔

اتنے میں پٹواری بھی پُہنچ گیا۔ اُس کے ساتھ اُس کا ایک ملازم بھی تھا جِس کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ پٹواری نے بتایا کہ ضلع کے افسروں نے اُسے شیر کے شِکار کے لیے دو کُتّوں کا اِنتظام کرنے کو کہا تھا اور یہ دونوں کتّے اِس وقت تلا کوٹ لائے جا رہے تھے۔

یہ جنگل میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں نے نمبردار سے کہا کہ میں وادی میں اُتر کر موقع پر جانا چاہتا ہوں۔ اِس پر عورت کا لڑکا جِس کا نام ڈنگر سنگھ تھا، میرے ساتھ چل پڑا اور باقی لوگ اُسی بلند جگہ پر ٹھہر گئے۔ البتہ پٹواری اور اُس کا

ملازم میرے ساتھ ہو لیے۔ شاید پٹواری کی رائے میں شیر کا شکار کوئی آسان کام تھا۔

ہم صرف چار سو گز تک ہی گئے ہوں گے کہ ڈنگر سنگھ نے ایک نالے کی طرف اِشارہ کر کے کہا کہ اُس جگہ شیر نے میری ماں پر حملہ کیا تھا۔ ڈنگر سنگھ کے پیچھے پٹواری اور اُس کا ملازم آ رہے تھے۔ میں نالے کی ریت میں شیر کے پاؤں کے نشانات تلاش کرنا چاہتا تھا۔ اِس لیے میں نے اُن سے کہا کہ باہر ہی ٹھہر جائیں اور خود احتیاط سے خشک نالے میں گھس گیا۔ باقی لوگ بلندی پر کھڑے تھے۔ اُن سے کوئی خاص اِشارہ ملنے پر ڈنگر سنگھ نے مجھ سے کہا کہ نیچے کوئی سُرخ سی چیز نظر آ رہی ہے۔ یہ سُرخ سی چیز اُس کی ماں کے کپڑے بھی ہو سکتے تھے اور کسی جانور کی لاش بھی۔ میں نے پٹواری کے نوکر سے بندوق لے کر اُس کے کارتوس نِکال لیے اور اُن سے کہا کہ وہ خاموشی سے درخت پر چڑھ جائیں۔

اب ڈنگر سنگھ نے ایک اور بلند چٹان کی طرف اِشارہ کیا اور کہا کہ اِس جگہ سے ہم اُس سُرخ چیز کو بخوبی دیکھ سکیں گے۔ ہم کُہنیوں کے بَل وہاں تک پہنچے اور نیچے نِگاہ ڈالی۔ اُس جگہ اور خشک نالے کے درمیان شاہ بلوط کے پودے اور بڑی بڑی گھاس تھی۔ اِسی خشک نالے میں آدم خور نے ڈنگر سنگھ کی ماں کی لاش کھائی تھی۔ نالے کے ساتھ ہی ایک کھیت تھا جس میں چار پانچ فُٹ اُونچی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ اِس گھاس پر دس دس فُٹ کے فاصلے پر دو شیر لیٹے ہوئے تھے۔ ایک شیر کی پُشت ہماری طرف تھی اور دوسرے کا پیٹ والا حِصّہ۔ ایک ذرا نزدیک تھا اور دوسرا ذرا فاصلے پر۔

میں نے گولی چلانے سے قبل اِس بات پر غور کیا کہ اگر نزدیکی شیر پر گولی چلائی جائے تو اس کی آواز سے فاصلے پر سویا ہوا شیر پہاڑی کی طرف بھاگ جائے گا۔ اگر فاصلے پر سوئے ہوئے شیر پر گولی چلاتا ہوں تو دوسرا شیر میری طرف آئے گا۔ چناں چہ میں نے دُور والے شیر کو پہلے نشانہ بنانے کا فیصلہ کیا، اُس کے دِل کا نشانہ باندھا اور بندوق کا گھوڑا دبا دیا۔ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ لیکن دوسرا شیر جَست لگا کر اُٹھا اور دوسرے ہی لمحے وہ خشک نالے کی منڈیر پر تھا اور اُس کا رُخ میری طرف تھا۔ میں نے ایک دَم دوسرا فائر کر دیا اور شیر پشت کے بَل نالے میں جا گرا۔ اب وہ نظروں سے اوجھل تھا۔

میں نے اُس جگہ جہاں پہلے فائر پر شیر مارا تھا گھنی گھاس میں کچھ جُنبش محسوس کی۔ لگتا تھا کوئی جانور گھاس کے اندر ہی اندر بھاگتا چلا جا رہا ہے۔ جب وہ ایک طرف مُڑا تو نظر آیا۔ یہ تیسرا شیر تھا۔ وہ بلندی پر تھا اِس لیے میں نے گولی چلا دی۔ میں نے دیکھا ہے کہ گولی کھا کر شیر مرنے سے قبل حرکت ضرور کرتا ہے لیکن اُس نے کوئی حرکت نہ کی۔ کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ نیچے کھسک رہا ہے۔ نیچے آٹھ دس فُٹ اونچا، شاہ بلوط کا ایک پودا تھا۔ کِھسکتا ہوا شیر اُس پودے میں یُوں اٹک گیا کہ اس کا سر اور اگلی ٹانگیں ایک طرف تھیں اور پچھلا دھڑ اور پچھلی ٹانگیں دوسری طرف لٹک رہی تھیں۔

جب دوسرے فائر پر میں نے تین شیر دیکھے تو مجھے خیال گُزرا کہ اُن میں ایک شیرنی ہے اور دو اُس کے بچّے ہوں گے اور اُن میں ایک نہ ایک ضرور آدم خور ہو گا جس نے عورت کی لاش کھائی تھی اور اپنے ساتھیوں کی دعوت کا اہتمام بھی کیا تھا۔

میں چاہتا تھا کہ آگے بڑھوں اور مردہ شیر تک پہنچ جاؤں لیکن شیر تو کھسک رہا تھا۔ جوں ہی وہ ذرا نیچے ہوا، میں نے فائر کر دیا۔ میں شرمندہ ہوں کہ نشانہ خطا گیا اور شیر غائب ہو گیا۔ ڈنگر سنگھ چِلّایا "دیکھیے صاحب! وہ شیر جا رہا ہے!"

میں سمجھا شاید شیر ہم پر حملہ کرنے والا ہے، لہٰذا میں نے رائفل سنبھالی۔ ڈنگر سنگھ پھر بولا "صاحب، اُدھر نہیں"۔ اور یہ کہہ کر اُس نے اس طرف اُنگلی کا رُخ کیا جہاں وادی ختم ہو جاتی تھی اور پہاڑی شروع ہوتی تھی۔ میں نے ایک شیر کو پہاڑی پر ترچھے رُخ جاتے دیکھا۔ شیر لنگڑا کر چل رہا تھا۔ اُس کے دائیں شانے پر خُون کا ایک بڑا نشان سا تھا۔ اِس زخم سے معلوم ہوا کہ یہ وہی شیر ہے جو شاہ بلوط کے درخت سے اٹک گیا تھا کیوں کہ اس کے شانے پر گولی لگی تھی۔ وہ چار سو گز

کے فاصلے پر تھا۔ مَیں نے درخت کی شاخیں ایک طرف ہٹائیں اور جُوں ہی شیر سامنے آیا، رائفل کا گھوڑا دبا دیا۔ گولی شیر کے سامنے زمین میں دھنس گئی۔ شیر اُچھلا لیکن پھر اُسی حالت میں چلنے لگا۔ میں اب چوتھی بار گولی چلانا چاہتا تھا لیکن گولیاں ختم ہو چکی تھیں۔ شیر لنگڑی رفتار سے پہاڑی کی طرف بڑھتا گیا حتیٰ کہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

شیر کے شکاری کہیں گے کہ میرے پاس اعشاریہ 275 کی رائفل کس مقصد کے لیے تھی اور میں صرف پانچ گولیاں لے کر شیر کے شکار کے لیے کیوں نکل کھڑا ہوا تھا؟ میرا جواب یہ ہے کہ میں گزشتہ بیس سال سے اسی رائفل سے شکار کھیل رہا تھا۔ یہ وزن میں کم اور تین سو گز تک نشانہ لے سکتی ہے۔ جہاں تک پانچ گولیوں کا تعلّق ہے تو میں عرض کرتا ہوں کہ میں شیر کے شِکار کے لیے نہیں گیا میرا مقصد صرف وہ جگہ معلوم کرنا تھی جہاں اُس عورت پر شیر نے حملہ کیا تھا۔

مَیں نے ایک شخص کو بھیج کر کافی گولیاں منگوالیں۔ قِصّہ اب بالکل صاف تھا۔ جو دو شیر میری رائفل سے مارے گئے تھے، وہ نوجوان بچّے تھے اور زخمی شیر در اصل شیرنی تھی، اور وہی آدم خور تھی۔ میں زخمی شیرنی کے پیچھے چل پڑا۔ اُس چٹان پر جہاں شیرنی پر مَیں نے فائر کیا تھا، کچھ بال گرے ہوئے تھے اور خُون کے نشانات بھی تھے۔ میں اسی سمت بڑھا لیکن خُون کے نشانات کچھ فاصلے پر جا کر غائب ہو گئے۔ یہاں سے تین سو گز آگے لمبی گھاس کا ایک قطعہ تھا۔ ہو سکتا تھا کہ شیرنی وہاں موجود ہو۔ لیکن اب تاریکی چھا رہی تھی۔ اِس لیے مَیں شیرنی کی تلاش کو دوسرے دِن کے لیے مُلتوی کر کے واپس آ گیا۔

دوسرے دن یعنی 8 اپریل کو ہم شیر کے بچوں کی کھالیں اتار رہے تھے کہ بہُت سے لوگ جمع ہو گئے۔ میں نے اُن سے کہا کہ اگر وہ ہانکے کا انتظام کر دیں تو شیرنی پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ لوگ مان گئے۔ وہ میرے ملازمین کے ساتھ پہاڑی کی طرف چل دیئے اور میں پگڈنڈی پر ہوتا ہوا وادی میں ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں وہ لوگ مجھے دیکھ سکتے تھے۔ مَیں نے اُن کو اِشارہ کرنے کے لیے ہیٹ سر سے اٹھایا۔ اُنہوں نے تالیاں بجائیں، گلے پھاڑے، شور مچایا لیکن جھاڑیوں میں سے کچھ بر آمد نہ ہوا۔ لہٰذا میں نے ہاتھ کے اِشارے سے کہہ دیا کہ وہ اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں۔

اب میں وادی میں اُس طرف جا رہا تھا جدھر شیرنی گئی تھی۔ تقریباً نصف میل کے فاصلے پر ایک گہرا اور چوڑا خشک برساتی نالہ تھا۔ مَیں اُس میں پھلانگ گیا۔ یہ نالہ تیس گز چوڑا اور اسّی فُٹ گہرا تھا۔ میرے خیال میں اگر کوئی جانور اِس میں گِر جاتا تو اُس کی ہڈّی پسلی سلامت نہ رہتی۔ بہر حال، میں نے اُترتے ہی اس میں ایک جانور موجود پایا۔ مگر یہ تو ہرن تھا جو اپنی گردن تڑوا بیٹھا تھا۔ میں آگے بڑھا تو نالے میں شیرنی کے پاؤں کے نشانات اس طرف بڑھتے ہوئے معلوم ہوئے جہاں نالہ کم گہرا تھا۔ اب یہ بات صاف تھی کہ شیرنی اپنے زخم کی تکلیف سے اتنی پریشان تھی کہ اُس نے ہرن کی طرف دھیان نہ دیا۔ میں اُس مقام تک پہنچا ہی تھا کہ اچانک بارش کا پانی آ گیا اور زمین پر خون کے پڑے ہوئے دھبّوں کو بہا کر لے گیا۔ اب میرے لیے آگے بڑھنا مشکل تھا۔ مَیں وہیں سے اپنے کیمپ واپس لوٹ آیا۔

میں نے سات اپریل کو شیرنی پر فائر کیا تھا اور آج دس تاریخ تھی۔ میں ان چار دنوں میں گاؤں والوں کی کوئی خدمت نہ کر سکا تھا اور سخت شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ چناں چہ رات کے گیارہ بجے میں نے رائفل اٹھائی، ملازموں کو بُلایا اور کہا کہ میں شیرنی کے تعاقب میں جا رہا ہوں۔ اگر کل رات تک واپس نہ آؤں تو وہ میرا کیمپ اٹھا کر شہر چلے جائیں اور میری فکر نہ کریں۔

میں کیمپ سے نکل کر اس مقام پر پہنچا جہاں شیرنی نظر آئی تھی۔ چاند کی روشنی میں جانوروں کے پاؤں سے بنے ہوئے راستوں پر شیرنی کے پاؤں کے نشانات کچھ نہ کچھ دیکھے جا سکتے تھے۔ میں انہی کی مدد سے آگے بڑھا اور ایک درخت کے نیچے آ کر ٹھہر گیا۔ درختوں کی ٹہنیوں کے ہلنے سے مَیں نے معلوم

کیا کہ اُن پر لنگور بیٹھے ہیں۔ میں اپنی پُشت درخت سے لگا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک شیرنی اندھیرے سے نکل کر چاندنی میں آ کر بیٹھ گئی۔ وہ ٹہنیوں پر شور مچاتے ہوئے لنگوروں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

شیرنی اِسی حالت میں تقریباً نِصف گھنٹا لیٹی رہی۔ اِس دوران میں کبھی کبھار مُڑ کر اِدھر اُدھر دیکھ لیتی۔ پھر اچانک وہ اٹھی اور بائیں جانب ایک خشک نالے کی طرف چل دی۔ اس وقت وہ زخم کی وجہ سے سخت تکلیف محسوس کر رہی تھی۔ میں درختوں کی آڑ لیتا ہوا اُس کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔ میری رفتار شیرنی سے زیادہ تھی۔ اِس لیے ہمارے درمیان فاصلہ کم ہوتا ہوتا صرف پچاس گز رہ گیا تھا۔ اب وہ نالے کے نزدیک کھڑی تھی۔

اچانک وہ نالے میں کُود گئی۔ اسی لمحے مَیں ایک درخت پر چڑھ گیا جو بارہ فُٹ بلند تھا۔ رات گزرتی گئی، یہاں تک کہ مشرق کی طرف سے صبح کا اُجالا نمودار ہوا۔ میں درخت سے نیچے اُتر آیا اور کیمپ کی طرف چل دیا۔ راستے میں ایک ندی پڑتی تھی۔ مَیں نے اس پر ہاتھ منہ صاف کیا، گندے کپڑے دھوئے اور اچھّی طرح نہایا۔ جب میں کیمپ میں پہنچا تو میرے ملازم مسرت سے آگے بڑھے۔ انہوں نے میرے بوٹ اتارے اور مجھے بستر پر لٹا کر کمبل اوڑھا دیا۔ بستر پر دراز ہوتے ہی میں سو گیا۔

نہ معلوم کتنی دیر تک سوتا رہا۔ اچانک مجھے یُوں محسوس ہوا جیسے لوگ کہَ رہے ہوں کہ صاحب کو جگا دو۔ میرے ملازم ٹال مٹول کرتے رہے لیکن لوگ نہ مانے۔ اُن کے شور سے میری آنکھ کُھل گئی۔ اُن لوگوں میں ڈنگر سنگھ بھی تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ ابھی ابھی آدم خور نے چھ بکریاں مار ڈالی ہیں۔ نیند سے میں تازہ دَم ہو گیا تھا۔ میں نے رائفل سنبھالی اور ڈنگر سنگھ کے ہمراہ چل دیا۔

ہم گاؤں سے پرے ایک پہاڑی پر چڑھ گئے۔ راستے میں ایک نالا بہتا تھا۔ ہم نے اُسے پار کیا۔ آگے کچھ گہرائی تھی اور یہاں تین بکریاں مُردہ پڑی تھیں۔ مجھے بعد میں بتایا گیا کہ چند بچّے بکریوں کا ریوڑ چراتے ہوئے اِدھر سے گزر رہے تھے اور کچھ لوگ نزدیک ہی جلانے کی لکڑیاں اکٹھی کر رہے تھے کہ اچانک آدم خور نمودار ہوا اور اُس نے چھ بکریاں مار ڈالیں۔ لوگوں نے شور مچایا تو شیر بھاگ گیا۔ لیکن افراتفری میں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کس طرف گیا۔ تین بکریوں کو لوگ اٹھا کر لے گئے تھے اور تین بکریاں وہیں پڑی تھیں۔

یہ معلوم نہ تھا کہ شیر کس طرف گیا۔ ایسی صورت میں کسی طرف جانا فضول تھا۔ لہٰذا یہی فیصلہ کیا گیا کہ اسی جگہ انتظار کیا جائے۔ میں نے ڈنگر سنگھ سے کہا کہ وہ گاؤں چلا جائے۔ جس گہرائی میں وہ بکریاں پڑی تھیں، اس کے نزدیک دو چٹانیں تھیں۔ اگلی کم اونچی اور پچھلی زیادہ اونچی۔ میں نے یہی جگہ منتخب کی تاکہ پشت محفوظ ہو جائے۔ دن کے دو بجے تھے۔ میں چٹان کی اوٹ لے کر، سر پر ہیٹ جما کر شیرنی کا انتظار

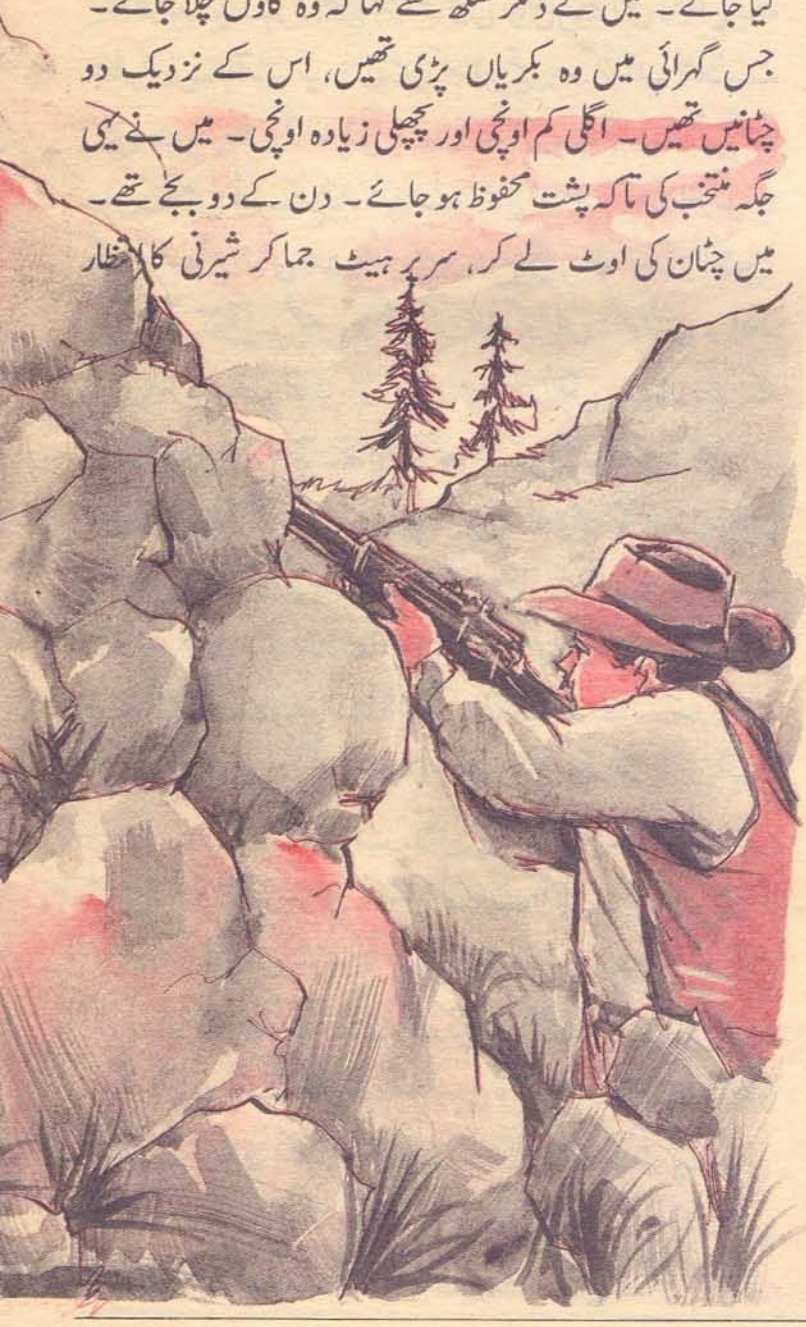

کرنے لگا۔ پہلے چھوٹی قسم کے مُردار خور پرندے آئے اور پھر گِدھ منڈلانے لگے۔ وقت گزرتا گیا۔ پہاڑی پر پرندے بولنے لگے اور پھر مُردار خور پرندے چیختے ہوئے اُڑے۔ یہ شیر کی آمد کی علامت تھی۔

شام ہو رہی تھی کہ آدم خور شیرنی بکریوں کے قریب پہنچی۔ وہ بکریوں سے کچھ فاصلے پر درخت کی اوٹ میں اِس طرح آکر بیٹھی کہ درخت کے تنے کے دائیں طرف اُس کا سر اور بائیں طرف پچھلا دھڑ نظر آتا تھا۔ وہ کچھ دیر اِسی طرح بیٹھی رہی۔ پھر اُٹھی اور چند قدم آگے بڑھی۔ اب وہ میرے نشانے پر تھی۔ میں نے اُس کے دل کا نشانہ باندھا اور گولی داغ دی۔ لیکن گولی شیرنی کے پیچھے زمین پر لگی جس سے مٹّی اُڑی اور شیرنی ایک جَست لگا کر اور نیچے گہرائی میں کُود گئی۔ میرا نشانہ خطا گیا تھا۔

اب میں ایک طرف جا کر گہرائی میں اُترا جہاں بڑی بڑی گھاس، اور ٹیڑھے میڑھے راستے تھے۔ لیکن میرے سر پر جنون سوار تھا۔ میں پانچ دِن سے اِسی آدم خور کے تعاقب میں تھا لیکن عین وقت پر میری گولی ضائع ہو گئی تھی۔ میں آگے بڑھتا گیا۔ ایک مقام پر میں نے ایک درخت کی شاخوں کو ایک طرف ہٹایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ شیرنی چند گز کے فاصلے پر بیٹھی ہے اور مجھ پر جَست لگانے کے لیے تیار ہے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک دَم اُچھلی لیکن میں نے اسے جھپٹنے کا موقع نہ دیا۔ ایک ہی لمحے میں میری رائفل کی گولی اُس کے جِسم کے پار ہو گئی اور دوسری گولی نے اس کی گردن توڑ ڈالی۔

لوگ دُور اونچائی پر کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ میرے ملازم بھاگتے ہوئے آئے اور اُس آدم خور کو اُٹھا کر تلا کوٹ لے گئے۔ اُنھوں نے کھال اتاری تو میں نے لاش کا معائنہ کیا۔ جو گولی میں نے 4 ر اپریل کو چلائی تھی، وہ اس کے شانے کے جوڑ میں اٹک کر رہ گئی تھی۔ دوسری اور تیسری گولیاں اس کے نہ لگی تھیں۔ چوتھی گولی اُس کے جسم سے پار ہو گئی تھی لیکن وہ کسی ہڈّی پر نہیں لگی تھی۔ پانچویں اور چھٹی گولی نے اُس کا کام تمام کر دیا۔

نئے سال کا پیغام

امانُ اللہ نیرؔ شوکت

کام جو محنت سے کرتا ہے اُسی کا نام ہے
درحقیقت کام ہی اِنسان کا آرام ہے
جب تلک زندہ رہو، مت جی چُراؤ کام سے
سالِ نَو کا ہر بشر کو بس یہی پیغام ہے

○

پیار کے تُم گیت گاؤ، ختم کر دو نفرتیں
جھُوٹ، چوری چھوڑ دو، اچّھی نہیں یہ عادَتیں
سیکھ لو گے پیار سے رہنا اگر تم، دوستو
زندگی بھر کے لیے تم کو ملیں گی راحتیں

○

سال وہ اچّھا ہے جو ہر آدَمی کو دے خوشی
سب رہیں آرام سے، پُرلُطف ہو یہ زندَگی
سالِ نَو کہتا ہے اُس کی ایک ہی بس شرط ہے
ہر طَرف جگ میں نظر آئے وفا کی روشنی

○

تاریخِ اسلام کی کہانی

وحشی کے دو تاریخی قتل

ڈاکٹر عبدالرؤف

وحشی بن حرب ابو دسمہ جبیر بن مطعم کا حبشی غلام تھا۔ اسے نیزہ بازی میں غیر معمولی کمال حاصل تھا۔ جنگِ بدر میں کفارِ مکّہ کو عبرتناک شکست ہوئی تھی۔ مطعم کا چچا، ابوسفیان کی بیوی ہند کا باپ، خود ابوجہل اور کئی دوسرے کافر اس جنگ میں مارے جا چکے تھے۔ کفّار نے اپنی شکست کا انتقام لینے کے لئے زور شور سے جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔ مطعم نے اپنے غلام وحشی سے یہ سودا طے کیا کہ اگر وہ آنحضورؐ کے چچا حضرت حمزہؓ کو ٹھکانے لگا دے تو اسے آزاد کر دیا جائے گا۔ ہند نے بھی اس سے انعام و اکرام کا وعدہ کر رکھا تھا۔ چنانچہ وحشی اس گھناؤنے جرم پر آمادہ ہو گیا۔

جنگِ اُحد میں وہ موقع کی تلاش میں ایک جگہ خاموشی سے تاک میں چھپا رہا۔ جونہی اسے حضرت حمزہؓ نظر آئے اس نے نشانہ باندھ کر نیزہ ان پر پھینکا اور انہیں وہیں شہید کر دیا۔ مطعم اور ہند اس واقعہ سے بہت خوش ہوئے۔ ہند نے جوشِ انتقام میں آکر حضرت حمزہؓ کا کلیجہ چبایا۔ پھر ان کے اعضا کاٹ کر گلے کا ہار بنایا اور گلے میں پہن کر انتقامی گیت گائے۔

کچھ عرصہ بعد وحشی مسلمان ہو گیا۔ مُسیلمہ کذّاب نے عرصہ سے جھوٹی نبوّت کا دعویٰ کر رکھا تھا۔ خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کی سرکردگی میں مُسیلمہ کے خلاف ایک لشکر روانہ کیا تو وحشی بھی اس میں شامل ہو گیا۔ اس معرکے کو جنگِ یمامہ کہتے ہیں۔ وحشی نے موقع پا کر اپنے اسی نیزے سے مُسیلمہ کذّاب کو ہلاک کر ڈالا جس سے اس نے سالوں پہلے حضرت حمزہؓ کو شہید کیا تھا۔

وحشی بحالتِ کُفر اپنے پہلے قتل پر بے حد پشیمان رہا کرتا تھا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد جھوٹے نبی مُسیلمہ کو قتل کرنے سے اس کا بوجھ قدرے ہلکا ہوا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ گو اسلام کے محسن حضرت حمزہؓ کے قتل کے بارے میں مجھ سے بڑی بھاری غلطی سرزد ہوئی، مگر اسلام کے بدترین دشمن کو بھی تو آخر میں نے ہی ٹھکانے لگایا۔

آیئے، دوست بنائیں

فیض الرحمٰن فیصل 14 سال
مطالعہ، کرکٹ
معرفت فرینڈز شوز شاہین
مارکیٹ صادق آباد

حامد محمود 13 سال
مطالعہ، ٹکٹ جمع کرنا
مکان A-521 گلی نمبر 6
موہن پورہ راولپنڈی

ناصر بلال 15 سال
تعلیم و تربیت پڑھنا، قلمی دوستی
معرفت حکیم صوفی عبدالحفیظ
محلہ اچھادارا گجرات

ندیم عباس 13 سال
معلوماتی کتابیں پڑھنا
معرفت ساجد گریانہ مرچنٹ
ریلوے روڈ میلسی

شکیل انور 16 سال
ہاکی، مطالعہ
مکان 331 بلاک 3 سیکٹر
A-2 ٹاؤن شپ لاہور

محمد ناظم 12 سال
مطالعہ
مکان B-6 نیو شالیمار
ٹاؤن گلشن راوی لاہور

ملک پرویز اختر 14 سال
مصوری، مطالعہ
قصبہ رکن پور تحصیل و ضلع
رحیم یار خاں

محمد برہان حیات 13 سال
کرکٹ، ٹکٹ جمع کرنا
معرفت محمد حیات
کالج روڈ گوجرانوالہ

جاوید اقبال 16 سال
کرانے، بیڈ منٹن
مکان 7 گلی 5 محلہ برکت
پورہ شالیمار ٹاؤن لاہور

احمد یار زہری 11 سال
کرکٹ
گورنمنٹ ہائی سکول
گوجرہ ضلع گجرات

محمد ایاز 16 سال
فٹ بال، قلمی دوستی
کوارٹر 5/1829 شاہ فیصل
کالونی۔ 5 کراچی 25

سید محمد احتشام 14 سال
انعامی مقابلوں میں شرکت
647/15 دستگیر سوسائٹی
فیڈرل بی ایریا کراچی 38

محمد وقاص سہیل 15 سال
کرکٹ، ہاکی
C/192 جناح اسکوائر
ملیر کالونی کراچی

فہد ابدالی 9 سال
کہانیاں پڑھنا، کرکٹ
A-87 بلاک ٹی
نارتھ ناظم آباد کراچی

محمد سعید مغل 15 سال
مطالعہ، قلمی دوستی
مکان 357 گلی 20
حسن پارک لنک روڈ لاہور

عمران خالق 11 سال
کہانیاں پڑھنا، قلمی دوستی
آر۔ 98 سیکٹر 15-A/5
بفرزون نارتھ کراچی 36

سجاد حسین 10 سال
مصوری، قلمی دوستی
گورنمنٹ ہائی سکول میکلوڈ گنج
منچن آباد ضلع بہاولنگر

محمد بلال 12 سال
قلمی دوستی، کرکٹ
مکان C-137 محلہ عالم خیل
میانوالی

سلمان نیّر مغل 14 سال
ٹکٹ اور سکّے جمع کرنا
نون شوگر ملز
بھلوال سرگودھا

کمال احمد 12 سال
مطالعہ، ٹکٹ جمع کرنا
مکان G-4137 گلی 2
قائد آباد پھلیلی حیدر آباد

ذیشان 16 سال
ٹکٹ جمع کرنا، آرگن بجانا
2/23
سنت نگر لاہور

عامر صدیق 14 سال
مطالعہ، قلمی دوستی، کرکٹ
مکان 249 گلی 3
کریم پارک لاہور

شہزاد نیاز 12 سال
کرکٹ، ہاکی
کربلا محلہ نزد گورا قبرستان
اٹک شہر۔

آیئے دوست بنائیں

جنوری : 1993ء

قلمی دوستی کی اس محفل میں شریک ہونے کے لیے

یہ کوپن پُر کرنا اور پاسپورٹ سائز بلیک اینڈ وائٹ تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

(لڑکیاں اس میں حصّہ نہیں لے سکتیں۔)

ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ شارع بن بادلیس لاہور۔

نام _____ عمر _____

مشاغل _____

پتا _____

میرے بھیّا

رضوانہ سیّد علی

بیگم وقار برآمدے میں بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھیں۔ نعیمہ اور آصفہ گڑیا کا گھر سجائے بیٹھی تھیں، اور آصف کیسٹ پلیئر پر ترانے سُن رہا تھا اور سر دُھن رہا تھا۔

گرمیوں کی لمبی چھٹیّوں کے آخری دِنوں میں جب سب تفریحی سرگرمیاں ختم ہو جاتی ہیں تو عُموماً وقت اِسی طرح سے گزارا جاتا ہے۔ گھڑیاں گِن گِن کر کٹتی ہیں کہ کب پوری ہوں اور اِسکول کھُلیں۔ بچّے تو اِسکول جانے کو بے چین ہوتے ہی ہیں، اُن کی مائیں بھی بے قرار ہوتی ہیں کہ اِسکول کھلیں تو یہ ننھّے شیطان پھر سے مصروف ہوں، اور ماؤں کو فراغت کی کچھ گھڑیاں مُیسّر آئیں۔

بیگم وقار سبزی بنانے میں محو تھیں کہ ایک دم آصف بول اُٹھا "امّی سُن رہی ہیں آپ؟"

"کیا؟" بیگم وقار، نے سر اُٹھا کر پوچھا۔

آپ کو اکثر شکایت رہتی ہے کہ آپ کے سر پر چار بال رہ گئے ہیں، اور اِنہیں دیکھیے کس قدر خوش ہو ہو کر اِعلان کر رہے ہیں کہ ۔

اِک بال ہے، اِک بال ہے
اِک بال ہے ہمارا

بیگم وقار بھونچکی سی ہو کر کچھ دیر آصف کو تکتی رہیں۔ پھر کافی دیر بعد بات سمجھ میں آئی تو ہنس پڑیں۔ کیسٹ پر جو ترانہ بج رہا تھا، اُس کے بول کچھ یُوں تھے:

اِقبال ہے، اِقبال ہے، اِقبال ہمارا

"شریر کہیں کا" اُنہوں نے کہا اور سر جُھکا لیا۔ آصفہ اور نعیمہ ہنس ہنس کر دوہری ہو گئیں، مگر امّی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ہاتھ کام کرنا بھول کر تھم چکے تھے اور وہ ماضی کی بُھول بُھلیّوں میں کھو چکی تھیں۔

"ناجو! ناجو!"

"اللہ! کیا ہے، بھائی جان؟ آپ تو تابڑ توڑ آوازیں دینے لگتے ہیں۔ میں ذرا کتابیں بیگ میں رکھ رہی تھی۔"

"کتابوں کی بچّی۔ روز دیر کروا دیتی ہے" ذیشان نے اُس کی لمبی سی چوٹی کو زور سے جھٹکا تو اُس نے چیخ چیخ کر رونا شروع کر دیا۔

اندر سے ابّو کو آتے دیکھ کر ذیشان نے جلدی سے اُسے چُمکار پچکار کر چُپ کروایا، ناجیہ نے آنکھیں پونچھ لیں، ابّو کے پوچھنے پر پاؤں پھسلنے کا بہانہ بنا دیا، اور پھر ذی شان کے ساتھ اسکوٹر پر بیٹھ کر اِسکول چلی گئی۔

ذیشان اور ناجیہ دو ہی بہن بھائی تھے۔ ناجیہ بِالکُل کم گو اور شرمیلی تھی، مگر ذیشان بلا کا شریر اور ذہین تھا۔ سارا دن گھر میں اودھم مچائے رکھتا۔ گھر بھر کی رونق اور سب کی آنکھوں کا تارا تھا۔ اُس نے اپنی زندگی کا ایک ہی مِشن بنا رکھا تھا کہ فوج میں جائے گا اور ملک کی سرحدوں کا رکھوالا بنے گا۔ اُس کے البم میں ہر بہادُر جرنیل کی تصویر سجی تھی۔ فوج کے بارے میں اُسے ہر طرح کی معلُومات تھیں۔

تحریکِ پاکستان کے بارے میں وہ بہت کچھ جانتا تھا کیوں کہ وہ ذوق و شوق سے مُطالعہ کرتا تھا اور بُزرگوں سے کُرید کُرید کر اُس زمانے کے بارے میں پوچھتا تھا جب ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے لہُو سے آزادی کا چراغ روشن کیا تھا۔ قائدِاعظم اُس کے محبوب لیڈر تھے۔ اُنھوں نے قوم کے بچّوں کو جو نصیحتیں کی تھیں، ذیشان نے انہیں خوش خط لکھ کر اپنے کمرے میں لٹکا رکھا تھا۔ وہ محنت سے جی لگا کر پڑھتا تھا تاکہ اُسے فوجی اِسکول میں داخلہ مل سکے۔

آخر اُس کی محنت رنگ لائی اور اُس نے میٹرک کا اِمتحان بہت اچھے نمبروں سے پاس کر لیا۔ اور پھر جس روز اُسے کیڈٹ کالج میں داخلہ ملا، اُس کی خوشی قابلِ دید تھی۔ وہ چلا گیا اور گھر کی سب رونقیں اپنے ساتھ لے گیا۔

ناجیہ بھائی کے بغیر سارے گھر میں بولائی بولائی پھرتی۔ بھائی کا ستانا اور پھر منانا یاد آتا تو رو پڑتی اور پھر دِن گِن گِن کر اُس کی واپسی کا اِنتظار کرتی۔ یوں ہی دن گزرتے رہے۔ ذیشان کیڈٹ کالج میں بھی بہترین طالبِ علم تھا اور آخر اُس کی اُمنگیں اور خواب پورے ہوئے اور ایک دن اُس نے فوجی وردی پہن لی۔

جس روز ذیشان فوجی وردی میں گھر آیا، اُس کا چہرہ اِتنا روشن اور خوب صورت لگ رہا تھا کہ اُس پر نظر نہ ٹھہرتی تھی۔ ناجیہ نے تو گھبرا کر اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ امّی نے بھی فوراً آیتُ الکرسی پڑھ کر اُس پر پھونکی تھی۔ اب ناجیہ ایک فوجی کی بہن تھی۔ وہ بہت فخر سے اپنی سہیلیوں میں بیٹھ کر اپنے بھائی کا ذکر کرتی اور سہیلیاں بھی اُسے رشک سے دیکھتی تھیں۔

ابھی ذیشان کو فوجی افسر بنے مُشکل سے ایک مہینا ہی گزرا تھا کہ اچانک بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا۔ یہ 6 ستمبر 1965ء کی بات ہے۔ حملے کی خبر سُنتے ہی پوری پاکستانی قوم، اپنے تمام جھگڑے بُھلا کر، دُشمن کے سامنے سِیسہ پِلائی ہُوئی دیوار بن گئی۔ ذیشان اُس دستے میں شامل تھا، جس کی کمان عزیز بھٹّی شہید کر رہے تھے۔ اُس کا شمار اُن شہیدوں میں ہُوا جن کا جسم بھی گھر واپس نہ آسکا۔ یہ وہ شہید ہیں جنہیں اِس وطن کا ذرّہ ذرّہ قیامت تک سلام کرتا رہے گا۔

امّی تو خیر شروع ہی سے بہت بہادر تھیں، بیٹے کی شہادت کا سُن کر اُنھوں نے الحمدُ للہ کہا۔ مگر جانے کیسے یکایک ناجیہ جیسی ڈرپوک اور بات بات پر رونے والی لڑکی بھی ایک دم بہادر، نِڈر اور دِلیر بن گئی تھی۔ وہ بڑھ چڑھ کر شہری دِفاع اور سرحدی دیہاتوں کے اُجڑے ہوئے لوگوں کے لیے کام کر رہی تھی۔ اِس وجہ سے سب لوگ اُس کی عزّت کرتے تھے۔ اب اُس کی عزّت اور بڑھ گئی تھی کہ وہ شہید کی بہن تھی۔ ناجیہ نے اپنے اِس اِعزاز کی لاج رکھی اور آنکھ سے ایک آنسو نہ گرنے دیا۔ اور آج 27 سال بعد جب کہ ناجیہ بیگم وقار ہے اور تین بچّوں کی ماں ہے، اُس نے تہیّہ کر رکھا ہے کہ اُس کا اِکلوتا بیٹا بھی فوج ہی میں جائے گا۔ سرحدوں کا رکھوالا اور ملک کا نگہ بان بنے گا اور اپنے ماموں کی جلائی ہُوئی مشعل کو لے کر آگے بڑھے گا۔

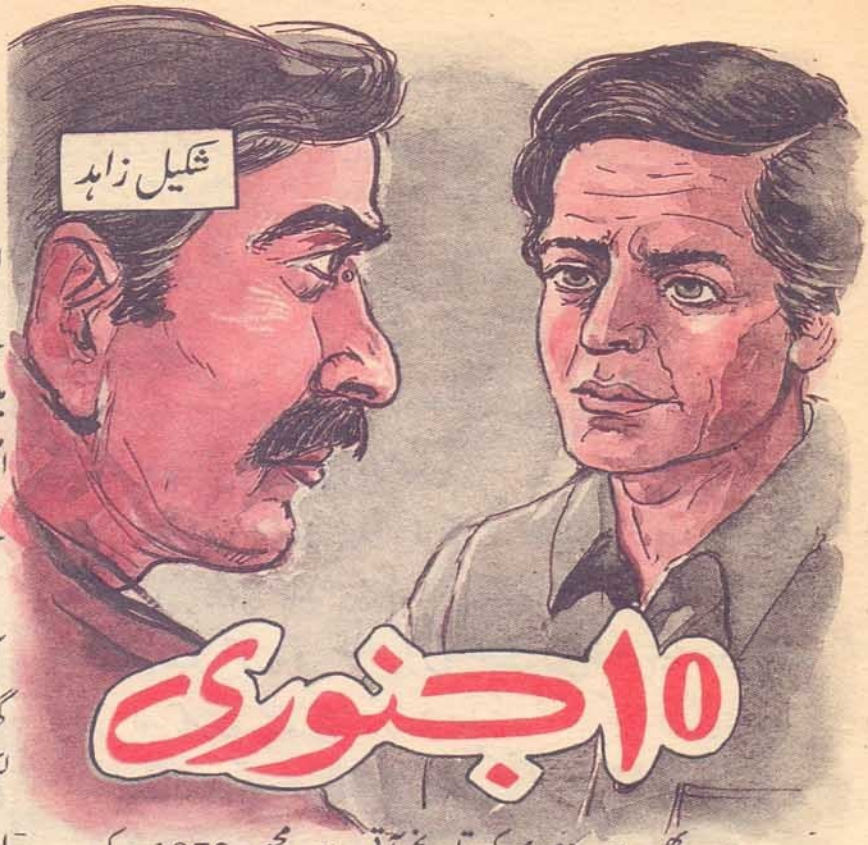

جب بھی دس جنوری کی تاریخ آتی ہے، مجھے 1972ء کی دس جنوری کی رات یاد آ جاتی ہے۔ اور اس یاد کے ساتھ ہی میرے جسم میں خوف اور دہشت کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔

اِس سے پہلے کہ میں آگے بڑھوں، مناسب ہو گا کہ آپ سے اپنا تعارُف کرا دوں۔ میرا نام اِکرامُ اللہ ہے اور میں ایک سرکاری ملازم ہوں۔ 1972ء میں مَیں ایک سرکاری محکمے میں نیا نیا بھرتی ہوا تھا اور میری پوسٹنگ ایک قصبے جمال پور میں ہوئی تھی۔ یہ قصبہ شمالی پنجاب میں ہے۔

میرا دفتر قصبے کے ایک چھوٹے سے پُررونق بازار میں تھا۔ قصبہ ہونے کے باوجود جمال پور حیران کُن حد تک صاف سُتھری بستی تھی۔ اِتنی صفائی تو میں نے اپنے شہر میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ یہاں کے لوگ بہُت خوش مزاج اور ملنسار تھے۔

جمال پور میں آئے مجھے ابھی نو دن ہوئے تھے کہ دس جنوری کو میں حسبِ معمول دفتر سے ڈھائی بجے نکلا۔ یہاں سے میرے مکان کا فاصِلہ کوئی پانچ میل ہو گا۔ میرا مکان کھیتوں کے درمیان تھا اور اُس کے اِرد گِرد پانچ گھر اور تھے۔ یہ سب اُن کسانوں کے تھے جن کے یہ کھیت تھے۔ وہاں سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر اِسی طرح کے پانچ چھ گھروں کی ایک اور بستی تھی، اور وہاں سے ایک میل کے فاصلے پر ایک اور بستی۔

میں نے دفتر سے مکان تک کا یہ فاصِلہ سائیکل پر طے کیا اور کھانا کھا کر سو رہا۔ میں شام کو کھیتوں کی سیر کیا کرتا، مغرب کے بعد کھانا کھا کر کچھ دیر کتاب پڑھتا اور پھر سو جاتا۔ قصبے میں بجلی نہیں تھی، اِس لیے لال ٹین کی روشنی میں پڑھتا تھا۔ اُس رات بھی تقریباً دس بجے لال ٹین بُجھا کر سونے کے لیے لیٹا تو تھوڑی دیر بعد ہی آنکھ لگ گئی۔

رات کو پتا نہیں کس وقت، سوتے سوتے، اچانک میری آنکھ کُھل گئی۔ ایسا لگا جیسے ابھی ابھی سویا ہوں۔ کمرے میں گھُپ اندھیرا تھا۔ میں نے تکیے کے نیچے سے گھڑی نکالی۔ لیکن گھُپ اندھیرے میں اُس کی سوئیاں نظر نہ آئیں۔ میں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑے سوچ ہی رہا تھا کہ میری آنکھ کیوں کھلی ہے کہ کمرے کی کھڑکی چرچرا کے کھلی اور کوئی شخص اُچک کر اندر آ گیا۔ اندھیرے میں صرف اس کا سایہ نظر آ رہا تھا۔ دہشت سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ میں لحاف میں چُپ چاپ دبکا اُس سائے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ سایہ چند لمحوں تک وہیں ساکت کھڑا رہا پھر اچانک ہلا اور کمرے میں کھٹ کی زور دار آواز آئی۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ وہ آواز کس چیز کی تھی تو میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ سائے کے ہاتھوں میں ایک لمبا سا چاقو تھا!

اس دہشت کی حالت میں بھی مجھے اُس کی آمد پر حیرت ہوئی۔ میری یہاں کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ ابھی تو مجھے آئے صرف نو دن ہی ہوئے تھے۔ اگر وہ یہاں چوری کی نیّت سے آیا تھا تو مجھے اُس کی حماقت پر قہقہہ لگانا چاہیئے تھا۔ میرے کمرے میں چند کتابیں، ایک چارپائی، بستر، لال ٹین اور پانی کے گھڑے کے سوا کچھ نہ تھا۔

چند لمحوں بعد میں نے دیکھا کہ وہ سایہ آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہا ہے۔ اُس کے ہاتھ میں کُھلا ہوا چاقو اِس اندھیرے میں بھی چمک رہا تھا یا شاید مجھے ہی خوف کی وجہ سے وہ چمکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے چِلّانا

چاہا تو میری آواز حلق میں گھُٹ کے رہ گئی۔ لگتا تھا حلق میں کانٹے پڑ گئے ہیں۔ میں نے اپنی جگہ سے ہلنا چاہا لیکن میری ٹانگیں جواب دے گئی تھیں۔ اب میں اپنی موت کو آہستہ آہستہ اپنی جانب بڑھتا دیکھ رہا تھا۔ اس کڑکتی سردی میں بھی میرے جسم سے پسینا چھوٹ رہا تھا اور سانس گھُٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ سایہ اب میرے بالکل سر پر پہنچ گیا تھا۔ میں نے اُس کی شکل دیکھنی چاہی مگر اندھیرا بہت زیادہ تھا۔ وہ میرے اُوپر جُھکا۔ شاید وہ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ میں سو رہا ہوں یا نہیں۔ میں نے ایک دم آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی سانسیں میں اپنے چہرے پر محسوس کر رہا تھا۔ میں اپنی زندگی میں کبھی اتنا بے بس نہیں ہوا تھا۔ وہ مجھے مارنے پر تُلا ہوا تھا اور میں اپنی جگہ سے ایک انچ بھی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔

اچانک وہ سیدھا ہو گیا۔ شاید اسے اِطمینان ہو گیا تھا کہ میں واقعی سو رہا ہوں۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ میری چھاتی پر رکھا اور دوسرا ہاتھ وار کرنے کے انداز میں اُٹھایا تو یکایک میرے ہاتھ پاؤں دوبارہ میرے قابو میں آ گئے۔ میں نے پُھرتی سے کروٹ لی اور چارپائی سے نیچے گر پڑا۔

اُس کا چاقو والا ہاتھ بستر میں کُھب گیا۔

میں تیزی سے لحاف میں سے نکلا اور کمرے میں ایک جانب دبک گیا۔ چُوں کہ وہ کھڑکی کے سامنے تھا، اِس لیئے مجھے اس کا سایہ نظر آ رہا تھا۔ لیکن میرے پیچھے دیوار تھی، اس لیے میں اسے نظر نہیں آ رہا ہوں گا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر اس کی بیٹھی بیٹھی آواز کمرے میں گونجی:

"بابو جی، تم جہاں کہیں بھی ہو، بچ نہیں سکو گے۔ میں آج تمہارا کام تمام کر کے ہی جاؤں گا۔"

میں جواب دینے ہی لگا تھا کہ اچانک رُک گیا۔ یہ اس کی چال تھی۔ اگر میں بول پڑتا تو وہ جان جاتا کہ میں کس جگہ ہوں۔ میں دم سادھے اپنی جگہ دبکا رہا۔

اب وہ چارپائی کا چکّر کاٹ کر میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں اسے نظر تو نہیں آ رہا ہوں گا، وہ بس اندازے سے آگے بڑھ رہا تھا۔ کمرے میں چند لمحے خاموشی طاری رہی، پھر اس کی آواز گونجی:

"بابو جی، جہاں کہیں بھی ہو، سامنے آ جاؤ، ورنہ تمہاری خیر نہیں۔"

"سامنے آنے کی صورت میں بھی تو خیر نہیں ہے" میں نے سوچا اور چُپ چاپ دبکا رہا۔

اچانک وہ مُڑا اور سیدھا میری طرف بڑھا۔ اتنی دیر میں اس کی آنکھیں شاید اندھیرے کی عادی ہو گئی تھیں۔ گاؤں کے رہنے والوں کی نظریں اِس معاملے میں خاصی تیز ہوتی ہیں۔

اور پھر وہ چلتے چلتے میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ غالباً مجھے ہی گھور رہا تھا۔ اس نے غُرّا کر کہا "پکڑے گئے نا، بابو جی۔ اب خدا کو یاد کرو۔"

خدا کے ذکر پر اچانک مجھ میں جانے کہاں سے جُرأت پیدا ہو گئی۔ میں نے سُن رکھا تھا کہ مارنے والے سے بچانے والا زیادہ طاقت وَر ہوتا ہے۔ میں نے بیٹھے بیٹھے اس کے گھُٹنے پر لات ماری۔ اُسے اِس حملے کی توقع نہیں تھی۔ وہ لڑکھڑایا اور چاقو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ جوں ہی چاقو کے گرنے کی آواز مجھے سُنائی دی، میں شیر ہو گیا، بجلی کی سی تیزی سے اُٹھا اور اس کے چہرے پر ایک گھونسا دے مارا۔ وہ غالباً پہلے حملے سے ہی بوکھلایا ہوا تھا۔ یہ حملہ سہ نہ سکا اور زمین پر گر پڑا۔ میں اس کی چھاتی پر سوار ہو گیا اور مُنہ پر گھونسے مارنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ چیں بول گیا۔ شروع شروع میں وہ ہاتھ پاؤں مارتا رہا لیکن پھر بالکل بے حرکت ہو گیا۔ میں چند لمحے اس کے سینے پر چڑھا بیٹھا رہا اور جب اس نے کوئی حرکت نہ کی تو آہستہ آہستہ اُٹھا اور ٹٹولتا ہُوا چارپائی تک گیا۔ میرے سرہانے ماچس رکھی تھی اور چارپائی کے نیچے لالٹین۔ میں نے جلدی سے لالٹین جلائی اور اس شخص کی طرف گیا۔

وہ بیس اِکّیس سال کا جوان تھا اور ہوش میں تھا۔ اس کے ہونٹ پھٹ گئے تھے۔ کنپٹی کے پاس سے بھی کھال پھٹ گئی

تھی۔ ناک سے بھی خون نکل رہا تھا۔ میں نے بڑی بے دردی سے اُسے مارا تھا۔

"کون ہو تم؟" میں نے پوچھا۔

"تم ..... تم اِکرامُ اللہ ہو نا؟ اُدھر بازار میں تمہارا دفتر ہے؟" وہ بولا۔

"ہاں، مگر تم کون ہو اور مجھے کیوں مارنا چاہتے ہو؟"

"تم نے ..... تم نے میرے باپ کو قتل کیا تھا۔ وہ تمہاری گاڑی کے نیچ آ کر مرا تھا" وہ نفرت سے بولا۔

"میں نے؟" میں حیرت سے بولا "لیکن میرے پاس تو کوئی گاڑی نہیں ہے۔ میرے پاس تو سائیکل ہے۔"

"چار سال پہلے تو تھی" وہ غرّایا "اُسی کے نیچے آ کر میرا باپ مرا تھا۔"

اب بات میری سمجھ میں آ گئی۔

"تم نے خود دیکھا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ لیکن لوگوں کا یہی کہنا تھا" وہ بولا۔

"تم نے اُسی وقت بدلہ کیوں نہیں لیا" میں نے پوچھا۔

"تم بھاگ جو گئے تھے" وہ غصّے سے بولا۔

میں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور چارپائی پر بٹھا دیا۔

"میرا نام اِکرامُ اللہ ضرور ہے، لیکن میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھ رہے ہو۔ مجھے یہاں آئے صرف نو دن ہوئے ہیں۔ چار سال پہلے تو میں لاہور میں تھا۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو" وہ بولا۔

"جن لوگوں نے اُس اکرام اللہ کو دیکھا تھا، چاہو تو اُن سے پُوچھ لو" میں نے کہا۔

اُس کی اُلجھن بڑھ گئی تھی۔ وہ چُپ چاپ میرا مُنہ تک رہا تھا۔

"صبح میرے ساتھ بازار چلنا اور وہاں لوگوں سے پوچھ لینا" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے" وہ سر ہلا کر بولا۔

صبح قصبے کے لوگوں نے میری بات کی تائید کر دی۔ اُنہوں نے مجھے بتایا کہ اُس اِکرامُ اللہ کو پولیس نے گرفتار کر لیا تھا اور اُسے سزا ہو گئی تھی۔

وہ لڑکا اب میرا دوست ہے۔ اُسے میں نے سمجھایا کہ قانون اپنے ہاتھ میں لینا بجائے خود ایک جُرم ہے۔ اگر میں اِس واقعے کا ذکر کسی سے کر دیتا تو آج وہ بھی جیل میں ہوتا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے زمانے کا قِصّہ ہے، ایک بستی میں دو آدمی رہتے تھے۔ ایک آدمی نیک اور دین دار تھا، دُوسرا پرلے درجے کا گُناہ گار۔ ایک دن کی بات ہے، حضرت عیسیٰؑ دین دار آدمی کے ساتھ کہیں سیر کو نکلے۔ آپ ٹہلتے جاتے تھے اور باتیں کرتے جاتے تھے۔ سامنے سے وہ گُناہ گار بھی آنکلا۔ اُسے اپنی نالائقی پر بہُت شرم آئی کہ آج کسی قابِل ہوتا تو حضرتؑ کے سامنے جاتا اور سلام کرتا۔ افسوس! میں تو مُنہ دکھانے کے بھی لائق نہیں۔ ساری عمر غفلت میں گزُار دی۔ بھلا اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے۔

وہ اِسی طرح شرم سے گردن جُھکائے اُن دونوں کے پیچھے پیچھے چلا جارہا تھا کہ دین دار آدمی نے پلٹ کر دیکھ لیا۔ اُسے اپنی عبادت کا غرُور تھا۔ گُناہ گار کا پیچھے پیچھے آنا بھی اُسے بُرا لگا کہ ایسے لوگوں کا ہم سے کیا واسطہ اور مسجد میں کتّے کا کیا کام؟

دین دار اِسی دِھیان میں تھا کہ خدا کی طرف سے حضرت عیسیٰؑ کو حکم ہُوا "اے عیسیٰؑ! جس آدمی کو اپنی عبادت کا غرور ہے، اُس سے کہہ دو کہ میں اچھّوں کو خوش کرنے کی خاطر، بُروں کو دُھتکارنا پسند نہیں کرتا۔ تمہاری عبادت کا نتیجہ تمہارے لیے ہے اور اِس کی شرمندگی کا پھل اِس کے لیے۔"

سچّی عبادت یہی ہے کہ آدمی عاجزی سیکھے، اِنکسار سے کام لے اور مجبوروں اور بے کسوں پر رحم کرے۔ وہ عبادت بھلا کس کام کی، جس سے سر میں غرور اور دل میں نفرت پیدا ہو۔

حضرت بایزید بُسطامیؒ ایک بڑے بُزرگ گزرے ہیں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے، عید کا دن تھا۔ آپ نے حمّام میں غسل کیا، نئے کپڑے پہنے اور جوں ہی گھر سے نکلے، ایک عجیب واقِعہ پیش آیا۔ گلی کے ایک مکان میں کسی نے چُولہا صاف کر کے گرم گرم راکھ کی ٹوکری کھڑکی سے باہر پھینکی تو وہ ساری راکھ آپؒ کے سر اور کپڑوں پر گری۔ تمام لباس اور بدن راکھ سے اَٹ گیا، بلکہ چہرہ بھی جُھلس گیا۔ اِس پر بھی آپ خفا ہونے کی بجائے خدا کا شکر ادا کرنے لگے کہ اے خدا! میں گُناہ گار تو دہکتی آگ کے لائق تھا۔ یہ بھی تیرا اِحسان ہے کہ صرف چہرہ جُھلسا اور میں بچ گیا۔

ایک بد چلن شہزادہ سیر کو جا رہا تھا۔ راستے میں ایک بُزرگ کا سامنا ہُوا۔ شہزادے نے بُزرگ پر پھبتیاں کسیں اور گالیں دیں، مگر وہ بڑے صابِر تھے۔ اُن کے ماتھے پر بَل نہ آیا۔ سب کچھ سُن کر آپ نے شہزادے کے حق میں دُعا کی کہ "اے خدا! تو نے اپنی مہربانی سے اِس نوجوان کو خوب صورت بنایا، اِسے صِحّت اور دولت دی اور حکومت بخشی۔ اب اپنے دیے کی شرم رکھ اور اِسے دوزخ میں نہ جھونکنا۔"

خیر، اُس وقت تو بات آئی گئی ہو گئی۔ شہزادہ محل میں پہنچا تو اُسے اپنی بدتمیزی کا دھیان آیا۔ بہُت شرمندہ ہُوا۔ سیدھا محل سے نکلا اور اُن بُزرگ کے مکان پر پہنچا۔ اُن سے سچّے دل سے معافی مانگی اور تمام گُناہوں سے توبہ کی۔ بُزرگ نے کہا "یہ خدا کی مہربانی ہے کہ اُس نے مجھے صابِر بنایا اور تمہیں یہ توفیق دی کہ اپنے کیے پر شرمندہ ہوتے ہو۔ میں اگر سختی سے کام لیتا تو تمہاری اِصلاح ہرگز نہیں ہو سکتی تھی۔"

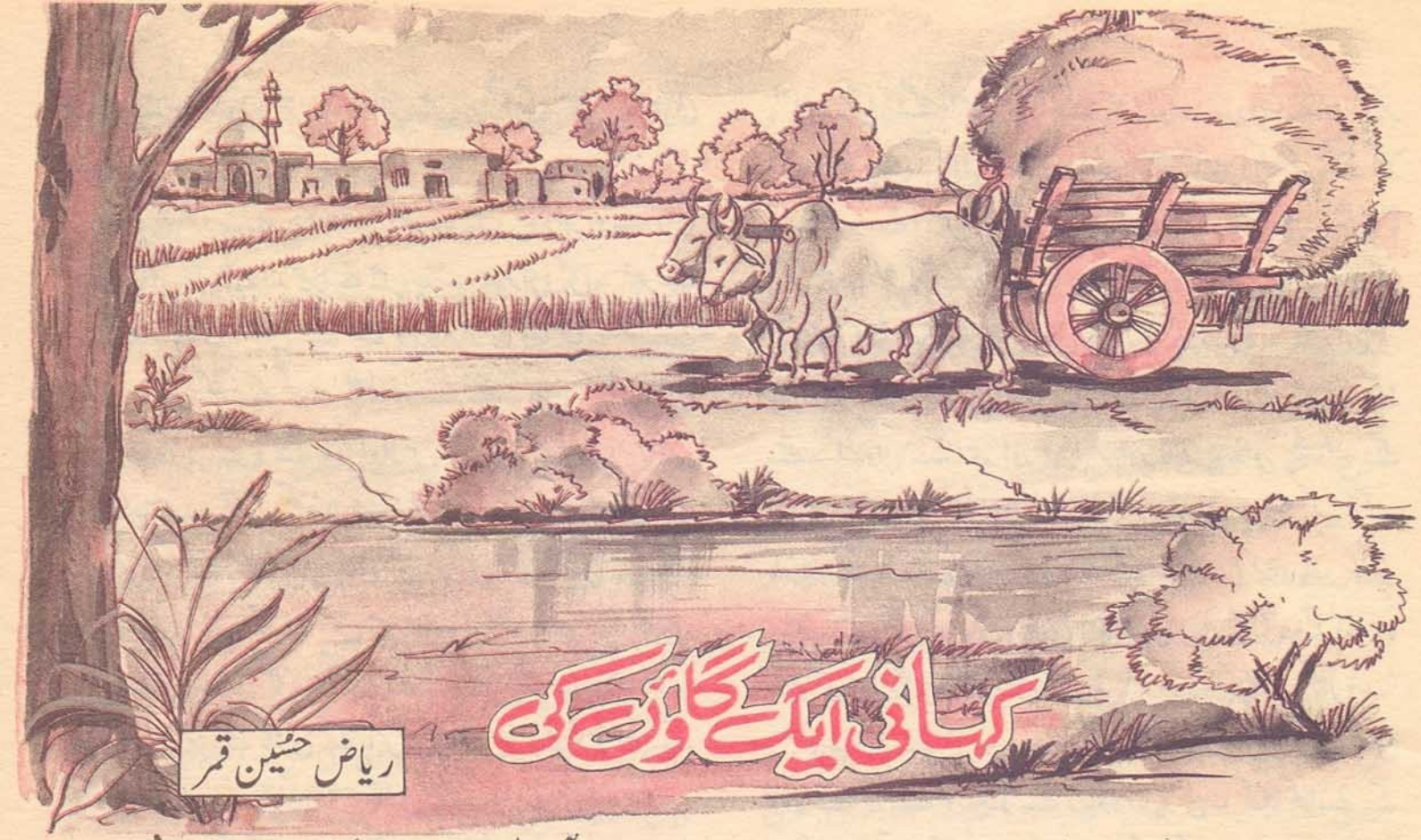

کہانی ایک گاؤں کی

ریاض حسین قمر

امجد میرے ہی دفتر میں کام کرتا ہے۔ وہ گاؤں کا رہنے والا ہے اور نہایت مخلص اور ملنسار انسان ہے۔ میری اور اُس کی دوستی کی وجہ بھی اُس کی سادگی اور اِنتہا درجے کا خلوص ہے۔ وہ مہینے کے آخری جمعے کے ساتھ دو چھٹیاں لے کر اپنے گاؤں جاتا ہے۔ اُس نے کئی بار مجھے گاؤں لے جانے کی کوشش کی مگر میں نے ہمیشہ ٹال مٹول سے کام لیا۔ ہم شہر کے رہنے والے لوگ گاؤں کی زندگی سے ناواقف ہوتے ہیں، اِس لیے گاؤں جانے سے ہچکچاتے ہیں۔

لیکن ایک بار امجد نے اِس قدر اِصرار کیا کہ مجھے ہاں کرنا ہی پڑی۔ میں نے اُس سے وعدہ کر لیا کہ اِس ماہ جب وہ گاؤں جائے گا تو میں بھی اُس کے ساتھ چلوں گا۔ یہ سُنتے ہی اُس کے چہرے پر رونق آ گئی۔

امجد نے مجھے بتایا تھا کہ ریلوے اِسٹیشن سے اُن کا گاؤں چار میل کے فاصلے پر ہے اور گاؤں کا ایک تانگے والا شرفو بابا ٹرین پہنچنے کے وقت اِسٹیشن پر موجود ہوتا ہے تاکہ گاڑی سے اُترنے والی سواریوں کو کسی دِقّت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

یہ دسمبر کی ایک جُمعرات تھی۔ ہم دونوں نے جُمعے کے بعد چار چار چھٹیاں لیں۔ جمعرات کو ہم نے بارہ بجے ہی اپنے اِنچارج سے اِجازت لے لی کیوں کہ امجد کے گاؤں کو جانے والی گاڑی دن کے ایک بجے روانہ ہوتی تھی۔ میں گھر سے تیّار ہو کر آیا تھا۔ ہم نے رکشا پکڑا اور سیدھے ریلوے اِسٹیشن پہنچ گئے۔ امجد دو ٹکٹ لے آیا اور ہم ایک بنچ پر بیٹھ کر خوش گپّیاں کرنے لگے۔ پلیٹ فارم پر لوگوں کا بہت رش تھا۔ بوڑھے، جوان، عورتیں، بچّے گاڑی کے اِنتظار میں بیٹھے تھے۔ ہم کس طرح گاڑی میں سوار ہوئے اور یہ سفر کیسے کٹا، یہ الگ داستان ہے۔ بہرحال، جب ہم گاؤں کے اِسٹیشن پر اُترے تو سورج اُفق کے اُس پار اُترنے کی تیّاری کر رہا تھا۔

جب ہم اِسٹیشن سے باہر آئے تو تانگہ نام کی کوئی چیز وہاں موجود نہ تھی۔ یہ دیکھ کر امجد پریشان ہو گیا۔ اُس کی پریشانی بالکل بجا تھی۔ سورج غروب ہونے والا تھا اور گاؤں اِسٹیشن سے چار میل کے فاصلے پر تھا۔ اُس دن گاؤں جانے والی اور کوئی سواری بھی گاڑی سے نہ اُتری تھی۔ بہرحال، ہم خدا کا نام لے کر پیدل ہی نہر کے کنارے کنارے چلنے لگے۔ یہ نہر امجد کے گاؤں کے پاس سے گزرتی تھی۔ امجد نے مجھے بتایا کہ

اُن کی زمین بہت زرخیز ہے۔ اُس میں ہر قسم کی فصل پیدا ہوتی ہے۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ مغرب میں نمودار ہونے والی سُرخی شام کے ملگجے اندھیرے میں جذب ہو رہی تھی۔ نہر کے کنارے لگے درختوں نے فضا کو پُراسرار بنا دیا تھا۔ نہر کے ساتھ ساتھ گنّے کے کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ اِن کھیتوں میں سے گیدڑوں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہم باتیں کرتے جا رہے تھے کہ گھنٹیاں بجنے کی آواز آئی۔ یہ بیلوں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی آواز تھی جو کسی بیل گاڑی میں جُتے ہوئے تھے۔ بیل گاڑی جس میں چارہ لدا تھا، امجد کے گاؤں کی طرف ہی جا رہی تھی۔ امجد نے مجھے تیز چلنے کے لیے کہا۔ جب ہم تیز تیز چلتے گاڑی کے پاس پہنچے تو امجد نے خوش ہو کے کہا کہ یہ تو اس کے چچا کی بیل گاڑی ہے۔

امجد نے چچا کو آواز دی تو اُنھوں نے گاڑی روک لی۔ وہ بیل گاڑی سے نیچے اُترے اور اِس طرح خلُوص سے ملے کہ میں حیران رہ گیا۔ اُنھوں نے ہمیں بیل گاڑی میں بیٹھنے کو کہا اور ہم چارے کے اُوپر بیٹھ گئے۔ بیل گاڑی ہچکولے کھاتی آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ میں زندگی میں پہلی بار کسی بیل گاڑی میں بیٹھا تھا۔

اب گاؤں قریب آ گیا تھا۔ لال ٹینوں اور دِیوں کی مدّھم روشنی کسی آبادی کا پتا دے رہی تھی۔ کچھ دیر بعد بیل گاڑی ایک حویلی میں داخل ہو گئی۔ یہ امجد کے چچا کی حویلی تھی۔ ہم نیچے اُترے تو امجد کی چچی نے ہماری بلائیں لیں اور ہمیں اندر کمرے میں چل کر بیٹھنے کو کہا۔ مگر امجد نے اُن سے کہا کہ آپ کے ہاں کل آئیں گے۔ اِس وقت ہمیں گھر جانا ہے۔ کچھ فاصلے پر امجد کی حویلی تھی۔ اُس کے صحن میں لکڑی کی کھُونٹی پر ٹنگی لال ٹین پورے صحن کو روشن کر رہی تھی۔ فضا میں خنکی تھی اور امجد کے گھر والے چُولہے کے گِرد بیٹھے آگ تاپ رہے تھے۔

ہم جُوں ہی صحن میں داخل ہوئے، امجد کے بہن بھائی "امجد بھیّا آ گئے، امجد بھیّا آ گئے" کہتے ہوئے دوڑے اور آ کر اُس سے لِپٹ گئے۔ وہ امجد کے ساتھ مجھے دیکھ کر ٹھٹکے مگر جب امجد نے اُنھیں بتایا کہ یہ تمہارے بھیّا ریاض ہیں، جن کا ذکر میں اکثر تم سے کیا کرتا ہوں، تو وہ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر "سلام بھائی جان، سلام بھائی جان" کہنے لگے۔ مجھے اُن کی یہ معصوم ادا بہت پسند آئی۔ امجد کی امّی اور ابّو بھی آ گئے تھے۔ اُنھوں نے امجد اور میرا سر اور ماتھا چوما اور چُولہے کے پاس ہی ایک چارپائی ڈال دی۔ ہم چارپائی پر بیٹھ کر آگ تاپنے لگے۔ امجد کی امّی نے آٹا گُوندھنا شروع کر دیا۔ ساتھ ساتھ باتیں بھی کر رہی تھیں، مامتا بھری، پیار بھری باتیں۔ وہ مجھے بھی اپنا سگا بیٹا سمجھ رہی تھیں۔ پھر وہ روٹی پکانے لگیں۔

جب ہم نے سرسوں کے ساگ کے ساتھ مکئی کی روٹی کھائی تو وہ مجھے قورمے اور پُلاؤ سے زیادہ لذیذ لگی۔ کھانا کھانے کے بعد دُودھ پتّی کا ایک بڑا سا پیالہ بھر کر مجھے دیا گیا۔ پھر ایک کمرے میں میرا اور امجد کا بستر لگا دیا گیا۔ ہم بستر پر لیٹ گئے۔ اب امجد سے ملنے کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھ گیا تھا۔ وہ اُسے ابّو امجد کہہ رہے تھے۔ اِن لوگوں کی باتوں میں خلُوص کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہُوا تھا۔ وہ امجد سے شہر کے بارے میں پوچھتے۔ بعض باتوں پر اپنی سمجھ کے مُطابق ہلکی پُھلکی بحث بھی کرتے۔ وہ لوگ مجھے بھی اُتنی ہی اہمیّت دے رہے تھے جتنی امجد کو۔ اُن میں کوچوان شرفو چاچا بھی تھا۔ وہ بُخار کی حالت میں ہی امجد سے ملنے آ گیا تھا۔ اُس نے امجد سے کہا کہ وہ بُخار کی وجہ سے آج تانگہ نہ جوت سکا اور ہم لوگوں کو تکلیف اُٹھانا پڑی۔ اِس گپ شپ کا سِلسلہ رات گئے تک چلتا رہا، یہاں تک کہ مجھے نیند نے آ دبوچا۔

صبح کسی کے دروازہ کھٹ کھٹانے پر میری آنکھ کُھلی۔ امجد ابھی گہری نیند سو رہا تھا۔ میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے امجد کے والد صاحب کھڑے تھے۔ میں نے اُنھیں سلام کیا تو جیتے رہو بیٹا کہہ کر وہ اندر آ گئے اور پوچھا کہ رات کیسے بسر ہوئی۔ میں نے اُنھیں بتایا کہ میں بڑے مزے سے

سویا۔ انہوں نے امجد کو بھی جگا دیا اور ہمیں نماز پڑھنے کو کہا۔ امجد انگڑائی لے کر اُٹھ بیٹھا اور ہم دونوں حویلی سے باہر آ گئے۔ باہر ہلکا اندھیرا چھایا ہُوا تھا۔

مسجد امجد کے گھر سے تھوڑے فاصلے پر تھی۔ وہاں وضو کے لیے گرم پانی کا اِنتظام تھا۔ ہم نے وضو کیا اور با جماعت نماز ادا کی۔ نماز کے بعد ہم دونوں نہر کی طرف نکل گئے تاکہ طلوعِ آفتاب کا نظارہ کر سکیں۔

نہر کے دونوں طرف گنّے اور کپاس کے کھیت عجب بہار دکھا رہے تھے۔ مشرق میں سُرخی نے صبح کے منظر کو بڑا سُہانا کر دیا تھا۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے درختوں کے جُھنڈ میں سے ایک سُرخ رنگ کا تھال سا نمودار ہُوا۔ یہ ایسا دِل فریب منظر تھا کہ میں اُسے کبھی نہ بُھلا سکوں گا۔ ہم شہر کے رہنے والوں کو سورج نکلنے کا ایسا منظر کہاں نصیب ہوتا ہے۔ فضا نکھری نکھری سی اور ہَوا دُھلی دُھلی سی لگ رہی تھی۔ نہ شور نہ دُھواں، نہ رکشا نہ ٹیکسی، نہ کسی قسم کی آلودگی جو شہروں کا مُقدّر بن چکی ہے۔ ہم کافی دیر تک قدرتی مناظر سے لُطف اندوز ہوتے رہے اور جب گھر واپس آئے تو ناشتا تیار تھا۔ امجد کی والدہ نے مُولی بھرے پراٹھے پکائے تھے۔ ہم نے خوب سیر ہو کر ناشتا کیا۔

اب دھوپ حویلی میں اُتر آئی تھی۔ ہم دھوپ میں چارپائیاں ڈال کر بیٹھ گئے اور خوش گپیاں کرنے لگے۔ جو لوگ کل رات امجد سے ملنے نہ آ سکے تھے، وہ اب آ گئے۔ ایک شخص کافی سارے گنّے لایا تھا۔ ہم گنّے چُوسنے لگے۔ اِس طرح گنّے چُوسنے کا بھی میرا یہ پہلا تجربہ تھا۔ ہم شہر کے باسی تو بنی بنائی گنڈیریاں چُوستے ہیں۔ مگر گنّے کو اِس طرح دانتوں سے چھیل کر چُوسنا کچھ اور ہی مزہ دیتا ہے۔ امجد کے بہن بھائی اب مُجھ سے مانوس ہو گئے تھے اور مجھے بھی گھر ہی کا ایک فرد سمجھ رہے تھے۔ امجد کی سب سے چھوٹی بہن رابعہ تو بالکل جاپانی گڑیا لگتی تھی۔ وہ میری گود میں بیٹھ کر توتلی زبان میں پیاری پیاری باتیں کرنے لگی۔

دوپہر کو مکئی کی روٹی کے ساتھ مکھن والے سرسوں کے ساگ اور چٹنی نے خوب مزہ دیا۔ اِس کے بعد لسّی نے سونے پر سُہاگے کا کام کیا۔ گاؤں کے ساتھ ہی ایک کھُلا میدان تھا۔ نمازِ عصر کے بعد بہت سے لوگ وہاں جمع ہو گئے اور طرح طرح کے کھیل کھیلنے لگے۔ بچّے ایک طرف رگّی ڈنڈا کھیل رہے تھے۔ مغرب کی اذان ہوتے ہی سب مسجد میں چلے گئے۔

رات کو امجد نے گاؤں کے داستان گو کو بُلایا۔ کمرے میں چارپائیاں بچھا دی گئیں اور کافی سارے لوگ امجد کے گھر اِکٹھے ہو گئے۔ تمباکو نوشی کے شوقین حُقّہ بھی ساتھ لے آئے تھے۔ پھر داستان گو نے ایک کہانی شروع کی۔ کہانی کیا تھی بس کئی کہانیوں کے ٹکڑے اِس طرح آپس میں جوڑ دیے گئے تھے کہ ایک دِلچسپ کہانی بن گئی تھی۔ داستان گو کا اندازِ بیان نہایت دِل نشین تھا۔ سب لوگ بڑے غور سے سُن رہے تھے۔ رات گئے یہ محفل ختم ہُوئی تو نیند نے فوراً ہی ہمیں اپنی گود میں لے لیا۔

دوسرے دن ہم سیر کرنے دُور تک نکل گئے۔ کئی جگہ بیلنے چل رہے تھے۔ ایک بیلنے پر گئے تو اُن لوگوں نے چادر بچھا کر ہمیں بیٹھنے کو کہا۔ مجھے گُڑ بنتا دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ ہم کافی دیر وہاں بیٹھے رہے۔ اُن لوگوں نے پہلے تو ہمیں لسّی میں گنّے کا رس مِلا کر پلایا اور بعد میں گرم گرم گُڑ کھانے کو دیا۔ دونوں چیزیں میرے لیے نئی تھیں۔ مجھے بہت مزہ آیا۔

چُھٹّیاں ختم ہو رہی تھیں۔ مگر میں گاؤں کی زندگی سے اِس قدر مانُوس ہو گیا تھا کہ واپس آنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ پُرخلوص لوگ، صاف سُتھری فضا، اور خالص غذا۔ یہ سب کچھ میرے پاؤں کی زنجیر بن رہا تھا مگر مجھے شہر لَوٹنا تھا۔ اُسی آلودگی میں، اُسی بناوٹ اور مطلب پرستی کے ماحول میں۔

جب ہم شرفو چاچا کے تانگے میں بیٹھے گاؤں کو خیرباد کہہ رہے تھے تو میری آنکھیں غم ناک ہو رہی تھیں۔ میں گاؤں والوں کے ہِلتے ہاتھوں کا ہاتھ ہِلا کر جواب دے رہا تھا اور میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔

مُعمّا

راز یُوسُفی

"اے بیگم! سُنتی ہو؟" مرزا حامِد بیگ الماری میں رکھی ہوئی کتابوں کو اُلٹ پلٹ کرتے ہوئے بولے "میں نے یہاں مُعمّے کے حل کی نقل رکھی تھی۔"

"میں کیا جانُوں۔ وہیں کہیں ہو گی" بیگم مُنک کر بولیں۔ وہ ابھی باورچی خانے میں گیلی لکڑیوں کے ساتھ سر کھپا رہی تھیں، جو پھُنکنی سے بار بار پھُونکیں مارنے کے باوجود سُلگنے کا نام نہ لے رہی تھیں۔

مرزا جی اِس رُوکھے پھیکے جواب پر جیسے سہم کر رہ گئے اور بڑی تیزی سے کاغذوں کو اُلٹنے پلٹنے لگے۔ مگر مُعمّے کے حل کی نقل کو جیسے زمین نِگل گئی تھی یا آسمان کھا گیا تھا۔ سرتوڑ کوشش کے باوجود ملنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔

مرزا جی کسی زمانے میں اچھّے کھاتے پیتے آدمی تھے اور ایک سرکاری محکمے میں ہیڈ کلرک تھے۔ مگر وقت بگڑتے دیر نہیں لگتی۔ معمولی سی بات پر افسر سے اَن بَن ہو گئی اور اُنہیں اِس بات پر اِتنا تاؤ آیا کہ مُلازمت سے اِستعفا دے کر گھر آکر بیٹھ رہے۔ مہنگائی کے زمانے میں ہاتھ سے مُلازمت کا نکل جانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ چند ہی دِنوں میں آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو گیا۔ بال بال قرض میں بندھ جانے کے باوجود مالی حالت کے سُدھرنے کی کوئی صورت نہ رہی۔ ایک لڑکا کالج میں تعلیم پا رہا تھا۔ وہ بھی تعلیم جاری نہ رکھ سکا۔

مرزا جی بڑے آرام پسند اِنسان تھے۔ ہر وقت گھر میں بیٹھے راتوں رات امیر بننے کے خواب دیکھتے اور اِس مقصد کے لیے اپنی بچی کھُچی پُونجی کو لاٹریوں اور مُعمّوں پر ضائع کرتے رہتے۔ اُن کی بیگم کو اُن کی یہ آرام پسندی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ وہ اُنہیں کام کاج کرنے پر اُکساتی رہتی مگر وہ بھی اپنی ہٹ کے پکّے تھے اپنی من مانی کرتے تھے۔ اِسی وجہ سے اکثر اُن کے گھر میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑا ہو جاتا تھا۔

مرزا جی ابھی حل کی نقل تلاش ہی کر رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ لپک کر باہر نکلے۔ دروازے پر تار والا کھڑا تھا۔ اُس نے ایک لِفافہ اُن کے ہاتھ میں دے دیا

اور سلام کر کے واپس چلا گیا۔ اُنہوں نے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے لِفافہ کھولا اور مارے خوشی کے اُن کی گھگّی بندھ گئی۔ اُنہوں نے صحیح مُعمّا حل کر کے چار لاکھ روپے کا اِنعام جیت لیا تھا اور انہیں تار کے ذریعے یہ خوش خبری دی گئی تھی۔

وہ بھاگے بھاگے اندر پہنچے اور جاتے ہی بیگم کو یہ خوشخبری سُنائی۔ پہلے تو بیگم کو یقین نہ آیا۔ لیکن جب اُنہوں نے تار کا مضمون پڑھ کر سُنایا تو یقین کرتے ہی بن پڑی۔ گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اُن کا اِکلوتا لڑکا راشد یہ خبر سُن کر پُھولا نہ سمایا اور اُلٹی سیدھی چھلانگیں لگانے لگا۔ پاس پڑوس کے رہنے والے مُبارک باد دینے لگے اور ہر طرف سے مٹھائی کا مُطالبہ ہونے لگا۔ مرزا جی اِس کامیابی پر بے حد مسرُور تھے۔ اُن کا چہرہ خوشی سے تم تمارہا تھا اور انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُن کے پر لگ گئے ہوں اور وہ ہوا میں اُڑے جا رہے ہوں۔ ابھی وہ اِنہی خیالوں میں ڈُوبے ہوئے تھے کہ دروازے پر ایک بھاری بھرکم آواز گونجی:

"آمد صائب؟"

"کون ہے بھائی؟" مرزا جی لپکتے جھپکتے باہر نکلے۔

"السّلامُ علیکُم" سُود خور پٹھان نے ایسی گرج دار آواز میں سلام کیا کہ مرزا جی اُچھل کر رہ گئے۔

"وعلیکُم السّلام" مرزا جی نے دھڑکتے ہوئے دل سے سلام کا جواب دیا اور اِشارے سے مردانہ کمرے میں لے گئے۔

"تشریف رکھیے، خان صاحِب" مرزا جی نے بڑی خوشامد سے کہا۔

"خوچہ، امارے پاس رکنے کے لیے کُچ نہیں اِے" پٹھان بڑی بڑی آنکھیں نکال کر بولا۔

"میرا مطلب ہے، بیٹھ جائیے۔"

"تو ایسا بولو نہ، بابا" پٹھان کُرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"فرمائیے، آج کیسے تکلیف کی آپ نے؟" مرزا جی نے پُوچھا۔

"او، تکلیف او گا تُمہیں۔ اَم تو ٹیک ٹاک اِے۔"

"آپ غلط سمجھے، خان صاحِب۔ میں تو یہ پوچھ رہا تھا کہ آپ کیسے آئے ہیں؟"

"او، اَم اپنی سائیکل پر آیا اِے، اور کیسے آتا؟"

"نہیں، خان صاحِب۔ میرا پوچھنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کس کام سے آئے ہیں؟"

"اچّا! یہ بات اِے۔ تو سُنو۔ اَم اپنا کرضہ وصول کرنے آیا اِے اور آج وصول کر کے اِی جائے گا۔ کیوں کہ تمہیں چار لاکھ روپیہ ملا اِے نا۔"

"خان صاحِب، ابھی تو صرف تار ہی ملا ہے۔ روپیہ نہیں ملا۔ یہ تار دیکھ لیجیے۔" مرزا جی نے اُس کی طرف تار بڑھاتے ہوئے کہا۔

"او خوچہ، یہ کاپر کی زبان اَم نہیں جانتا۔"

"خان صاحِب، ایک ہفتے تک چیک بُھن جائے گا۔ پھر آپ کو پائی پائی ادا کر دوں گا۔ بے فکر رہیں۔"

"اچّا، اَم آپ کی بات کا اِعتبار کرتا اِے۔ ایک ہفتے بعد اَم پھر آئے گا اور اپنا کرض لے کر اِی جائے گا۔ آپ کی کوئی بات نہیں سُنے گا۔"

"ٹھیک ہے، خان صاحِب۔"

سُود خور پٹھان ڈرا دھمکا کر چلا گیا اور مرزا جی کی ساری خوشی ڈھیر ہو کر رہ گئی۔ وہ گہرے فکر میں ڈوبے ہوئے بوجھل قدموں کے ساتھ اندر پہنچے۔

بیگم نے مرزا جی کا سُتا ہُوا چہرہ دیکھ کر پوچھا "خیر تو ہے؟ آپ بڑے فِکر مند نظر آ رہے ہیں؟"

"وُہی سُود خور پٹھان آیا تھا۔ اچھّے خاصے مُوڈ کا ستیاناس کر گیا۔ قرض بھی کیسی بُری لعنت ہے۔ قرض نہ لیا ہوتا تو کیوں بُری بھلی باتیں سُننی پڑتیں۔"

"خیر، اب تو اللہ میاں نے ہمارے دن پھیر دیے ہیں۔ چار لاکھ روپے کی رقم کچھ کم نہیں ہوتی۔ تمام دِلدّر دُور ہو جائیں گے۔ سب سے پہلے تو اُس کا قرض ہی چُکانا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں سب سے پہلے اِسی لعنت سے چُھٹکارا

پاؤں گا، پھر سمن آباد میں ایک عالی شان بنگلا بنواؤں گا۔"

"نہیں، سمن آباد میں نہیں، گلبرگ میں" بیگم نے لقمہ دیا۔

"چلو، گلبرگ میں ہی سہی۔ دو چار ہزار کا فرق بھی کوئی فرق ہوتا ہے۔ اور ہاں، بنگلے کے ساتھ کار کا ہونا بھی نہایت ضروری ہے۔"

"اِس میں کیا شک ہے۔ کار کے بغیر بنگلا اُدھورا رہتا ہے، اور کار بھی بیوک ہونی چاہیئے" بیگم اترا کر بولیں۔

"مجھے تو شیورلیٹ پسند ہے۔"

"چلو، شیورلیٹ ہی سہی۔ آپ کی پسند میری پسند۔"

"کار اور بنگلے کے ساتھ مُلازموں کا ہونا بھی ضروری ہے۔"

"اِس ضرورت سے کس کافر کو اِنکار ہے۔ ساری زندگی باورچی خانے میں سر کھپایا ہے۔ میں نے تو آج ہی سے سوچ لیا ہے کہ جب تک مُعمّے کی رقم نہیں آتی، کھانا ہوٹل ہی سے منگواؤں گی۔ بھلا مُلازموں کے بغیر بھی کوئی زندگی ہے؟"

"بیگم، اب تو تمہیں یقین آگیا ہو گا کہ اللہ میاں نے ہمیں کیسا اعلیٰ درجے کا دماغ دیا ہے۔ یہ مُعمّے بنانے والا بھی ارسطو کی اُولاد بنا پھرتا تھا۔ مگر اُس کو ایسی اُلٹی پٹخنی دی ہے کہ عُمر بھر یاد رکھے گا۔ ہی ہی ہی۔"

"کیا کہنے ہیں آپ کے دماغ کے۔ خدا بُری نظر سے محفوظ رکھے۔ اِس مرتبہ تو آپ نے کمال ہی کر دکھایا۔ ٹھہریے، میں آپ کے ماتھے پر توے کی کالک لگا دوں۔ بڑی بوڑھیوں کا کہنا ہے کہ اِس ٹوٹکے سے بُری نظر نہیں لگتی۔"

بیگم نے اُٹھ کر اُنگلی میں توے کی ذرا سی کالک لگائی اور اُسے مرزا جی کی پیشانی سے چھُوا دیا۔

"اجی ہٹو بھی۔ میں ایسی باتوں کا قائل نہیں۔"

"آپ ہوں یا نہ ہوں۔ میں تو ہوں۔"

"خیر، تمہاری مرضی۔"

"ہاں، خوب یاد آیا۔ اب ہمیں راشد کی شادی بھی کر ہی دینی چاہیئے، نجمہ کے ساتھ۔"

"نجمہ؟ کون نجمہ .....؟" مرزا جی دماغ پر زور دے کر بولے۔

"ارے! آپ نجمہ کو بھول گئے؟ میرے بھائی جان کی اِکلوتی بچّی۔ چندے آفتاب، چندے ماہتاب۔ آپ نے تو بہت دِنوں سے اُسے دیکھا ہی نہیں۔ میں پچھلے سال جب بھائی جان کے ہاں گئی تو اُسے دیکھ کر بھونچکا سی رہ گئی۔ کیسا بُوٹا سا قد نکالا ہے میری بھتیجی نے۔ لاکھوں میں ایک ہے۔ گھر میں دُلہن بن کر آئے گی تو بجلی کی روشنی کی ضرورت نہ رہے گی۔ اور پھر بچپن میں راشِد سے اُس کی منگنی بھی تو ہو چکی ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو، بیگم" مرزا جی جُھنجھلا کر بولے "اب راشد کی نجمہ سے شادی نہیں ہو سکے گی۔"

"کیوں نہیں ہو سکے گی؟ کیا کیڑے پڑ گئے ہیں میری بھتیجی میں؟ قبول صورت ہے۔ پڑھی لکھی ہے۔"

"اوہو! لکھنا پڑھنا ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا۔ راشد اب لکھ پتی باپ کا بیٹا ہے اور نجمہ؟ اب کیا کہوں۔"

"آپ یہی کہنا چاہتے ہیں نا کہ میرے بھائی جان غریب ہیں؟ تو پھر کیا ہُوا؟ یہ تو اللہ کی دین ہے۔ کل تک ہم بھی تو غریب تھے۔ اور پھر امیری غریبی کے فرق سے رشتے تو نہیں ٹُوٹ جاتے۔"

"ٹُوٹ جاتے ہیں۔ اب راشد کی شادی کسی امیر گھرانے میں ہی ہو گی تاکہ جہیز میں ڈھیر سا مال ملے۔ امیر گھرانوں کے بچّوں کے بیاہ امیر گھرانوں ہی میں اچھے لگتے ہیں۔"

"تو آپ ایک ہی دن میں بدل گئے۔ مگر میں ایسا نہیں ہونے دُوں گی۔ راشد کا بیاہ نجمہ کے ساتھ ہی ہو گا۔"

"نہیں ہو گا۔ ہرگز نہیں ہو گا۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ اِس گھر میں جو کچھ میں چاہوں گا، وہی ہو گا۔"

"میرے جیتے جی تو ایسا نہ ہو گا۔ میں جان دے دوں گی۔"

"تمہاری کسے پروا ہے۔ تمہارے مرنے کے بعد میں

دوسری شادی کر لوں گا۔"

"او خدا! یہ دولت بھی کتنی بڑی مُصیبت ہے۔ ابھی دولت کا سایہ بھی نہیں دیکھا کہ گھر خاک ہونے لگا۔ کیا تمام دولت مندوں کے دل اِسی طرح پتھر کے بن جاتے ہیں؟"

"کیوں نہ بن جائیں؟ دولت کا نشہ بہت تیز ہوتا ہے۔ اور اب تو میں بھی دولت مند ہُوں۔ لکھ پتی ہُوں ..... ہاہا..... ہاہا۔"

ابھی مرزا جی کے قہقہے فضا میں گونج ہی رہے تھے کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ مرزا جی "کون ہے بھائی" کہتے ہوئے باہر کی طرف لپکے۔ وہی تار والا ایک مرتبہ پھر دروازے پر کھڑا اُن کا اِنتظار کر رہا تھا۔ مرزا جی نے جلدی جلدی تار لیا اور لِفافہ کھولتے ہوئے اندر پہنچے۔ ابھی تار کا پورا مضمون بھی نہ پڑھ پائے تھے کہ کاغذ اُن کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ لڑکھڑاتے ہوئے چارپائی پر گر پڑے۔ تار میں لکھا تھا:

"ہم بڑے افسوس کے ساتھ آپ کو یہ اِطّلاع دیتے ہیں کہ مُعمّے کا پہلا اِنعام فیصل آباد کے حامِد صاحب کا تھا مگر دفتر کی غلطی سے پہلے اِنعام کا تار آپ کو دے دیا گیا، جس کے لیے ہم معافی چاہتے ہیں۔"

گاجر کھایئے

1941ء کا سال تھا۔ دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئے دو سال ہو چکے تھے۔ دُوسرے مُلکوں کی طرح اِنگلستان میں بھی خوراک کی کمی تھی۔ لیکن اِس برس خوش قسمتی سے گاجر کی فصل بہت اچھی ہوئی تھی اور حکومت چاہتی تھی کہ لوگ زیادہ سے زیادہ گاجر کھائیں۔ لیکن سوال یہ تھا کہ گاجر کھانے پر لوگوں کو آمادہ کس طرح کیا جائے؟

آخر وزیرِ خوراک کو ایک ترکیب سُوجھی۔ اُس نے ملک میں یہ افواہ پھیلا دی کہ انگریز ہوا باز گاجر کھاتے ہیں، جس سے اُن کی نگاہ بہت تیز ہو گئی ہے، اور وہ اندھیرے میں بھی دشمن (جرمنی) کے فوجی ٹھکانوں پر ٹھیک ٹھیک نشانے لگاتے ہیں۔ یہ افواہ پھیلنا تھی کہ انگریزوں نے دھڑا دھڑ گاجریں کھانا شروع کر دیں اور اِس طرح گوشت، انڈے، مچھلی اور اناج کی کافی بچت ہو گئی۔

گاجر بہت مُفید سبزی ہے۔ یہ کچّی بھی کھائی جاتی ہے اور پکا کر بھی۔ لیکن کچّی زیادہ فائدہ مند ہے۔ اب یہ تو ٹھیک سے پتا نہیں کہ اِس کا وطن کون سا ہے اور سب سے پہلے یہ دُنیا کے کس ملک میں کاشت کی گئی، لیکن اِتنا معلوم ہے کہ اِنسان اِسے صدیوں سے اِستعمال کر رہا ہے اور یہ دنیا کے تقریباً تمام ملکوں میں بوئی اور کھائی جاتی ہے۔

آج سے 70 سال پہلے تک لوگ گاجریں صرف پیٹ بھرنے کے لیے کھاتے تھے اور اِس کے فائدوں سے بے خبر تھے۔ 1920 میں سائنس دانوں نے دریافت کیا کہ گاجر میں ایک خاص چیز پائی جاتی ہے جسے "کیروٹین" کہتے ہیں۔ جب کیروٹین اِنسان کے جگر میں پہنچتی ہے تو وٹامن A میں بدل جاتی ہے اور وٹامن A نگاہ کے لیے بہت مفید ہے۔ وٹامن A ہماری جِلد کے لیے بھی فائدہ مند ہے۔ یہ جِلد کو بہت سی بیماریوں سے بچاتا اور اُسے تن دُرست رکھتا ہے۔ وٹامن A کے عِلاوہ گاجر میں معدنی نمک، کیلسیم اور کئی دوسرے وٹامن (خاص کر C) بھی پائے جاتے ہیں۔ اِسی لیے ڈاکٹر گُردے اور جگر کے مریضوں کو گاجر کھانے کی تاکید کرتے ہیں۔ اور دمے کے مریض کے لیے تو یہ اِکسیر ہے۔

پس آپ آج ہی سے روزانہ، وقفے وقفے سے، دو گاجریں ضرور کھایئے۔ چند ہی ہفتوں میں آپ کی نِگاہ تیز ہو جائے گی اور آپ جسم میں نئی قُوّت بھی محسوس کریں گے۔ لیکن گاجر کو چھیلیے نہیں۔ چھیلنے سے اِس کے بہت سے وٹامن اور نمک ضائع ہو جاتے ہیں۔ دھو کر اور خوب چبا کر کھایئے۔

(س۔ ل)

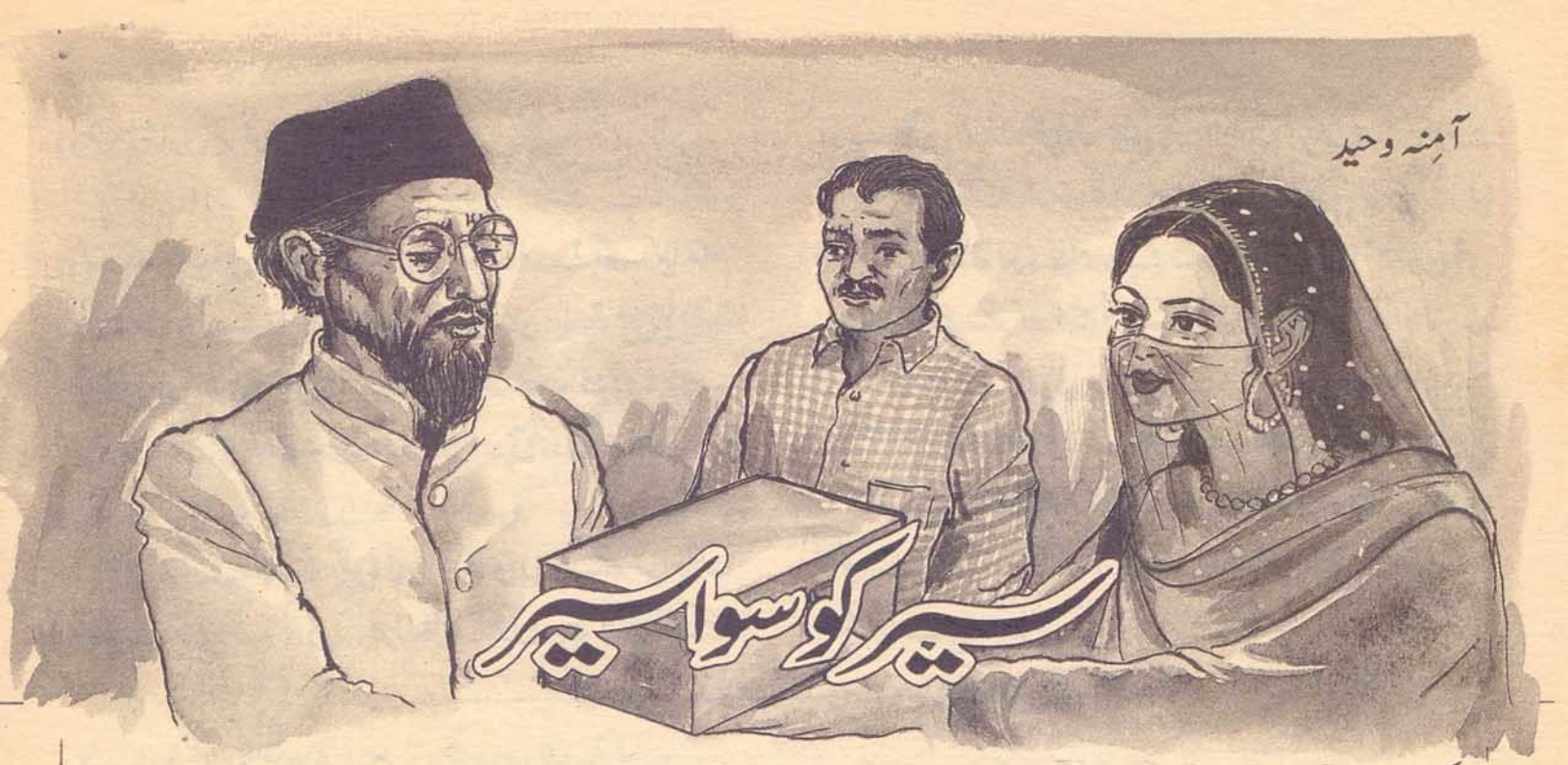

سیر کو سوا سیر

آمنہ وحید

کسی گاؤں میں ایک آدمی رہتا تھا۔ وہ بہت محنت کرتا تھا، لیکن بے چارہ غریب کا غریب ہی رہا۔ آخر اُس نے فیصلہ کیا کہ شہر جا کر دولت کمائے۔ اُس نے اپنے گھر والوں کو خیرباد کہا اور شہر پہنچ گیا۔ وہ گھر گھر جا کر لوگوں کے چھوٹے موٹے کام کرتا اور اِس طرح اُسے بہت کام مِل جاتا۔ وہ صرف کھانے پینے پر کچھ پیسہ خرچ کرتا اور باقی پیسوں کو ایک چھوٹی سی تھیلی میں جمع کرتا جاتا۔

وہ اِسی طرح کئی سال محنت کر کے پیسے کماتا رہا اور آخر پانچ سو روپے جمع کر لیے۔ لیکن اب وہ پریشان رہنے لگا تھا۔ اُس کو ہر وقت یہ خیال رہتا کہ کہیں یہ روپے کھو نہ جائیں یا کوئی اِنہیں چُرا نہ لے۔

ایک روز رات کو وہ کروٹیں بدل رہا تھا۔ اُس کی نگاہ سامنے رکھی ہوئی الماری پر تھی۔ یکایک اُسے شہر کے قاضی کا خیال آ گیا جس کے مُتعلق لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ بے حد نیک اور ایمان دار ہے۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ کل وہ ساری رقم اُسے دے آئے گا۔ وہاں زیادہ محفوظ رہے گی۔ یہ سوچ کر وہ سو گیا۔ اگلے روز صبح کو وہ اپنی تھیلی لے کر قاضی کے پاس گیا اور اُس سے کہا:

"میں نے کئی برسوں میں یہ رقم جمع کی ہے۔ مجھے اِس کے ضائع ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ آپ امین اور نیک ہیں، لہٰذا میرے یہ روپے امانت رکھ لیجیے۔"

قاضی نے جھٹ اُس کے ہاتھ سے تھیلی لے لی اور بولا "تم نے ٹھیک سُنا ہے، میرے بھائی۔ جب دل چاہے یہ روپے لے جانا۔ اُس وقت تک میرے پاس محفوظ رہیں گے۔"

آدمی اُس کو دُعائیں دیتا ہُوا رُخصت ہو گیا۔ اُس کے جاتے ہی قاضی نے رقم گِنی اور پھر اُس تھیلی کو ایک بڑے سے صندوق میں بند کر دیا۔

کچھ عرصے بعد وہ آدمی قاضی کے پاس گیا اور اُس سے اپنی رقم طلب کی۔ قاضی نے اُسے گھورتے ہوئے کہا "کون سی رقم؟"

"وہی پانچ سو روپے جو میں آپ کو دے گیا تھا" آدمی نے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے تمہارے دماغ میں کچھ خرابی ہے۔ تم نے مجھے کوئی رقم نہیں دی۔ تین پُشتوں سے ہمارے خاندان میں کسی نے دس روپوں سے زیادہ نہیں دیکھے اور تم پانچ سو روپوں کی بات کر رہے ہو" یہ کہہ کر قاضی نے اپنے مُلازموں سے اُسے دھکّے دے کر نِکلوا دیا۔

آدمی بے چارہ رو پڑا اور اپنے آپ سے کہنے لگا "میری محنت خاک میں مل گئی۔ افسوس! لالچی قاضی نے مجھے لُوٹ کر کہیں کا نہ چھوڑا۔"

اِتفاق سے اُدھر سے ایک عورت گزر رہی تھی۔ اُس نے اُس کی آہ و زاری سُنی تو ماجرا پُوچھا۔ اُس نے اُسے سارا واقعہ سُنایا۔ عورت اُسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئی۔ وہاں اُس نے ایک صندوق سر پر رکھا اور اپنے لڑکے سے بولی "میں اِس آدمی کو قاضی کے گھر لے جا رہی ہوں۔ تم ہمارے پیچھے آؤ۔ مگر ذرا دُور رہنا۔ جب تم دیکھو کہ قاضی صندوق لینے کے لیے ہاتھ بڑھا رہا ہے تو تم یہ کہتے ہوئے اندر آ جانا کہ ابّا واپس آ گئے ہیں۔ سمجھ گئے؟" لڑکے نے یقین دِلایا کہ جو کچھ اُس سے کہا گیا ہے، وہ اُس پر عمل کرے گا۔

قاضی کے مکان پر پہنچ کر عورت نے اُس آدمی سے کہا "تم ذرا باہر ہی رہنا۔ پہلے میں جاؤں گی۔ بعد میں تم آنا۔"

قاضی عورت کو دیکھ کر حیرت سے بولا "کیوں بہن، کیسے آنا ہُوا؟"

عورت بولی "شاید تم مجھے جانتے ہو گے۔ میں اِس شہر کے مشہور تاجر ہاشم کی بیوی ہُوں۔ اِن دنوں وہ باہر گئے ہوئے ہیں۔ یہ صندوق میں آپ کے پاس رکھوانے آئی ہوں۔ اکیلے مکان میں خوف آتا ہے۔ کہیں چوری نہ ہو جائے۔"

قاضی نے صندوق دیکھا اور پھر دل ہی دل میں یہ سوچ کر خوش ہُوا کہ اچھّا مال ہاتھ آیا ہے۔ خاصا وزنی معلوم ہوتا ہے۔ اِس میں سات آٹھ ہزار روپے تو ہوں گے ہی۔ ممکن ہے ہیرے جواہرات بھی ہوں۔ اُس نے عورت سے کہا "بہن، یہ خزانہ میرے پاس بڑی حِفاظت سے رہے گا۔ تم فکر نہ کرو۔"

عورت بولی "کیا آپ یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ مال مجھے اِسی طرح واپس مل جائے گا؟ میرا مطلب ہے، کوئی کمی بیشی تو نہ ہو گی؟"

"آپ فکر نہ کریں، بہن" قاضی بولا "سارے شہر کے لوگ میری نیکی اور اِیمان داری کی تعریف کرتے ہیں"

اُسی وقت وہ آدمی اندر گیا۔ قاضی دل ہی دل میں بے حد خوش ہُوا کہ یہ بڑے اچھّے موقع پر آیا ہے۔ میں اپنی ایمان داری کا ثبوت دینے کے لیے عورت کے سامنے اِس کی رقم لوٹا دیتا ہُوں۔ پانچ سو روپوں کے بدلے میں اتنی بہت سی رقم ہاتھ آئے گی۔" اُس نے عورت سے کہا "بہن، یہ وہ شخص ہے جو کچھ دن ہوئے اپنے پانچ سو روپے میرے پاس رکھوا گیا تھا۔ آج صبح یہ میرے پاس آیا، مگر میں اِسے پہچان نہ سکا۔ اگر کوئی مجھے یقین دلا دے کہ یہ وہی شخص ہے تو میں اِسی وقت اِس کی رقم لوٹا دُوں گا۔"

عورت نے کہا "میں اِسے جانتی ہوں۔ یہ کئی سال سے یہاں محنت مزدوری کر رہا ہے اور اب واپس اپنے گھر جانا چاہتا ہے۔"

قاضی بولا "ٹھہرو، میرے بھائی، تمہاری امانت میرے پاس حفاظت سے رکھی ہوئی ہے۔ ابھی لاتا ہُوں"۔ یہ کہہ کر وہ پانچ سو روپے لے آیا اور اُس آدمی کو دے کر بولا "لو بہن، اب تو تمہیں میری اِیمانداری کا علم ہو گیا۔ اب یہ صندوق میرے حوالے کر دو اور بے فکر اپنے گھر چلی جاؤ۔"

قاضی نے صندوق لینے کے لیے ہاتھ بڑھائے ہی تھے کہ اُسی وقت عورت کا لڑکا چیختا چلّاتا اندر آیا اور کہنے لگا، "امّی، امّی! فوراً گھر چلیے۔ ابّا واپس آ گئے ہیں"۔ عورت نے یہ کہتے ہوئے صندوق واپس لے لیا "اب جب کہ میرے شوہر واپس آ گئے ہیں، مجھے کوئی خوف نہیں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔" یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ اور وہ قاضی؟ وہ بے چارہ غُصّے میں اپنی ڈاڑھی نوچتا رہ گیا۔ بار بار کہہ رہا تھا "افسوس! میں کس قدر بد نصیب ہُوں۔ ہائے! ہائے! سونے کی چڑیا ہاتھ سے نکل گئی۔"

آپ کا خط ملا

دسمبر کا شمارہ بہت شان دار تھا۔ سرورق دیکھتے ہی جسم میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ کہانیوں میں انوکھا علاج، سونے کی ڈلی، سگنل والا، گندہ رومال اور چور کون پڑھ کر بے ساختہ اِس لاجواب رسالے کو داد دینے کو دِل چاہا۔ (علی اصغر جدران، فیصل آباد)

سرورق موسم اور مہینے کے مطابق تھا۔ لیکن اگر قائد اعظمؒ کی تصویر ہوتی تو کیا بات تھی۔ بہرحال کہانیوں نے خوب مزہ دیا۔ لطیفے بالکل نئے اور زبردست تھے۔ جب اپنی اِنعام یافتہ تصویر پر نظر پڑی تو دِل باغ باغ ہو گیا۔ (عمران سُہیل بوبی)

اتنا اِنتظار بھی اچھا نہیں ہوتا۔ آج یعنی 6 دسمبر کو تعلیم و تربیت مِلا ہے۔ کہانی نمبر کا بے چینی سے انتظار ہے۔ (سیّدہ صائمہ دلدار جھمرہ)

میں نے تعلیم و تربیت اپریل 1992ء سے پڑھنا شروع کیا۔ یہ مجھے اِس لیے بہت پسند ہے کہ اِس میں بڑی مزے دار کہانیاں اور لطیفے ہوتے ہیں۔ (شازیہ لودھی پشاور شہر)

دسمبر کا شمارہ سب گھر والوں کو بہت پسند آیا۔ سرورق انتہائی خوبصورت تھا۔ لطیفے ذائقے دار تھے اور کہانیوں میں تو کسی خامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (خُدا محمد عادِل بنّوں)

اِس دفعہ کا سرورق اتنا خوبصورت تھا کہ دِل چاہا اِس کو فریم کروا لوں۔ کیا برف باری کا نقشہ پیش کیا ہے! دِل خُوش کر دیا۔ حسبِ سابق کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ "قائدِ اعظم" اور "سردی آئی" نظمیں بھی بہت اچھی لگیں۔ (سعدیہ شہزاد ساہیوال)

مجھے آپ کا تعلیم و تربیت بہت پسند ہے اور اِس بار تو سب سے زیادہ اچھا لگا۔ میری طرف سے آپ کو نیا سال مُبارک ہو۔ (مہ جبین پشاور)

جنوری سے رسالے میں نئی تبدیلیاں کی جائیں۔ مثلاً اِنعامی سِلسلوں کی تعداد بڑھائی جائے اور ایک تصویر دِی جائے جس کا عنوان بچے تجویز کریں۔ (محصنہ خلیل میرپور آزاد کشمیر)

ہمیشہ کی طرح سرورق بہترین تھا، بالکل دسمبر کے موسم کے مطابق۔ کسی بھی کہانی کو بُرا نہیں کہا جا سکتا۔ "کیا کیوں کیسے" اور "ناقابلِ یقین" کا سلسلہ بہت معلوماتی ہے۔ نظمیں بھی اچھی تھیں۔ (شازیہ سحر لاہور)

میں 3 سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہی ہوں۔ یہ رسالہ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ اِس کو پڑھنے سے مُجھے بہت سی اچھی باتیں اور نئی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ دسمبر کے شمارے کا سرورق بہت اچھا تھا اور کہانیاں بھی لاجواب تھیں۔ (رضوانہ شبّیر احمد علامہ اِقبال روڈ لاہور)

میں نے تعلیم و تربیت جنوری 1992ء سے پڑھنا شُروع کیا اور اِسے بہت دِلچسپ پایا۔ اِس بار مجھے انوکھا علاج، سگنل والا، گندہ رومال اور چور کون کہانیاں پسند آئیں۔ (جلیل احسن علی چنجی تحصیل تلہ گنگ)

"آپ بھی لکھئے" میں پہلا اِنعام حاصل کرنے والی کہانی میں لکھا ہے کہ اشرف کی ماں نے اُسے سودا خریدنے کے لیے 15 روپے دیئے جب کہ اس نے چیزیں 55 روپے کی خریدیں۔ اب وہ پریشان ہے کہ پانچ روپے کہاں سے لائے؟ آپ سے گزارش ہے کہ اِس طرح کی غلطیاں نہ کیا کریں جنہیں پڑھ کر ہنسی بھی آئے اور غُصّہ بھی۔ (محمد بابر رؤف جھنگ روڈ فیصل آباد۔ خُرم مصطفیٰ جان۔ عظمیٰ نورین چشلم کالونی میانوالی۔ صدف عروج لاہور۔ صوفیہ علوی۔ حسین علی حضرو)

○ ..... اشرف کی ماں نے اسے 50 روپے دیئے تھے۔ غلطی سے 15 چھپ گئے۔ ہمیں خُوشی ہے کہ آپ تعلیم و تربیت بہت غور سے پڑھتے ہیں۔

دسمبر کے رسالے کا سرورق بہت خُوبصورت تھا۔ کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ "کیا، کیوں، کیسے" اور "ناقابلِ یقین" بھی اچھے سلسلے ہیں۔ (یاسر مصطفیٰ راولپنڈی)

دسمبر کا شمارہ نمبر ون تھا، خاص طور پر ٹائٹل تو بہت ہی اچھا تھا۔ سب کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ قائدِ اعظم نظم بھی اچھی تھی۔ (محمد خالد چشتی لاہور)

دسمبر کا تعلیم و تربیت یکم کو ہی مِل گیا۔ عظیم مسلمان کا سِلسلہ ابھی تک جاری ہے، حالانکہ اِس کی مُخالفت میں کتنے ہی خطوط آ چکے ہیں۔ اِس کی جگہ "اہم ایجادات" کا سِلسلہ شُروع کریں تو بہتر ہو گا۔ (عشرت علی ساہیوال)

پچھلے ماہ "ہونہار مصوّر" میں پہلے اور چوتھے نمبر پر آنے والی تصاویر نقل شُدہ ہیں۔ پہلی تصویر جولائی 1992ء کے کشمیر نمبر کے صفحہ نمبر 3 پر بنے ہوئے بُوڑھے آدمی سے لی گئی ہے، جب کہ چوتھی پوزیشن پر آنے والی تصویر اکتوبر 1992ء کے شُمارے کے صفحہ نمبر 15 پر دیے گئے بُوڑھے آدمی سے مِلتی جُلتی ہے۔ (محمّد زُبیر اصغر گورمل یونیورسٹی ڈی آئی خان)

○ ..... اچھے سے اچھا آرٹسٹ بھی بغیر کسی حوالے یا ماڈل کے تصویر نہیں بنا سکتا۔ بچّے تو پھر بچّے ہیں۔ اگر اِن ساتھیوں نے تعلیم و تربیت

میں چھپی ہوئی تصویروں سے مدد لی ہے تو کوئی حرج نہیں۔

دسمبر کا شمارہ جلد ہی مل گیا۔ تمام کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ لطیفے پڑھ کر مزہ آگیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ تمام رسالہ ہی تعریف کے قابل ہے۔ (رابعہ بٹ عیون لاہور)

سرورق اتنا خوبصورت تھا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ کہانیوں میں سونے کی ڈلی، سگنل والا، خدا کے لیے، بہت اچھی کہانیاں تھیں۔ کہانی نمبر کا بے چینی سے انتظار ہے۔ (غلام جان شنکیاری ہزارہ)

اس دفعہ تعلیم و تربیت دسمبر کی دو تاریخ ہی کو مل گیا۔ تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ رسالے کو دیکھ کر ایک شعر ذہن میں آیا۔

شعر عرض ہے:

پھول تو بہت ہیں مگر گلاب جیسا کوئی نہیں
رسالے تو بہت ہیں مگر تعلیم و تربیت جیسا کوئی نہیں

امید ہے شعر پسند آیا ہو گا۔ (جمشید عالم ٹیکسلا)

○ .....واہ! شعر تو بہت اچھا ہے۔ بس ذرا پٹڑی سے اترا ہوا ہے۔

دسمبر کا تعلیم و تربیت خوبصورت سرورق کے ساتھ جلوہ افروز ہوا۔ اس دفعہ تو لطائف بہت ہی معیاری تھے اور کہانیاں بھی بہت اچھی تھیں۔ (راشد منہاس ثاقب برج کلاں ضلع قصور)

تعلم و تربیت ہمارا پسندیدہ رسالہ ہے۔ ہم سب اسے شوق سے پڑھتے ہیں۔ اس دفعہ تمام کہانیاں معیاری تھیں۔ سرورق بھی جاذبِ نظر تھا لطیفے بھی مزے دار تھے۔ (فائزہ شاکر چشمہ بیراج)

دسمبر کا تعلیم و تربیت تین دسمبر کو ملا۔ ٹائٹل پر سردی نے ڈیرا جمایا ہوا تھا۔ خاص نمبر کا شدت سے انتظار ہے۔ ہماری طرف سے سب بچوں کو اور آپ کو نیا سال مبارک ہو۔

(پیرزادہ مسعود احمد صدیقی اسلام آباد)

تمام تحریریں قابلِ تعریف تھیں۔ یہ سن کر کہ جنوری میں کہانی نمبر شائع ہو رہا ہے بہت خوشی ہوئی۔

(محمد اقبال سعید اور زیتون ناز۔ واں بھچراں)

ہمیں دسمبر کے شمارے میں سونے کی ڈلی، سگنل والا، گندہ رومال اور شیش ناگ کہانیاں پسند آئیں۔ نظموں میں "سردی آئی" اچھی لگی۔ (صہیب طارق اچھرہ لاہور)

ان ساتھیوں نے بھی دسمبر کے شمارے کو پسند کیا ہے:۔

غلام عباس شیخ پنو عاقل۔ عروج، عائشہ، نادرہ راولپنڈی، سجاد حسین شاہ چک نمبر 410 تحصیل سمندری۔ محمد اویس لالہ رخ واہ چھاؤنی۔ اعجاز قادر رحیم یار خان۔ محمد سعید انجم ٹھیکواں والا۔ محمد یاسین کھوکھر غازی پور۔ شمائلہ کراچی۔ سیما عابد لاہور۔ عفیفہ عطا اور مریم عطا حویلیاں۔ طاہرہ نذیر رحیم یار خان۔ قاسم رشی راولپنڈی۔ محمد امجد کسووال۔ مصباح ہارون بہاولپور۔ سجاد خان کیڈٹ کالج حسن ابدال۔ میمونہ صدیقہ ملتان۔ شعیب اسلام عرفان غازی آباد۔ آمنہ حمید، احمد بلال قصور۔ سارہ حسن بہاولپور۔ لعل بخش شیخ مانجھی پور۔ غفار فاروق جنڈاں والا۔ عطیہ بتول فیصل آباد۔ علی اصغر پڈا گوجرانوالہ۔ امتیاز احمد خاں لودھراں۔ کلیم شیخ بادامی باغ لاہور۔ محمد عرفان شہزاد مردان۔ قاسم علی گاؤں ڈھکالا ضلع راولپنڈی۔ سائرہ بانو لاہور۔ محمد افضل مراد نواں شہر ملتان۔ شہباز طارق لاہور۔ سعد صدیقی حویلیاں۔ خرم آفتاب احمد گوجرانوالہ۔ فقیہ رضوی علامہ اقبال ٹاؤن لاہور۔ ہارون اقبال چیچہ وطنی۔ فاطمہ سعید کوہاٹ۔ فرحت العین ارشد تحصیل چیچہ وطنی۔ کاشف احمد جناح آباد ایبٹ آباد۔ الطاف حسین جھنڈیر بستی ملوک۔ عرفان القدیر راجپوت کیڈٹ کالج پیٹارو سندھ۔ بلال انور اور عمر احمد نیو مسلم ٹاؤن لاہور۔ اظہر منیر باٹا پور لاہور۔ رومانہ افشین شورکوٹ۔ سمیعہ رشید حیدر آباد۔ قرۃ العین رفیق میرپور خاص۔ سعدیہ محمد انور بٹ گوجرانوالہ۔ محمد طاہر جاوید چشتیاں۔ رضوان ہرل راولپنڈی۔ سردار فیصل مسعود خان چک نمبر 184 گ ب۔ میر عدیل پرویز مظفر آباد۔ عفیفہ نصیر لاہور۔ کاشف علی شاد گاؤں ترڈیوالی تحصیل فیروز والا۔ ذیشان رفیق علی ماڈل ٹاؤن لاہور۔ شہزاد احمد اسلام آباد۔ سرفراز احمد اسلام آباد۔ پرنس عامر محمود طاہر سکھ پور اوکاڑہ۔ عفت جہاں بنوں۔ برکت علی ہزارہ سانگھڑ۔ الطاف حسین چک 1047 ضلع ساہیوال۔ محمد اسلم موضع ساہو کا تحصیل بورے والا۔ نصرت زمان شبنم ضلع سرگودھا۔ شمیم فتح محمد صادق آباد۔ آصف جاوید کراچی۔ محمد نعیم وارثی پی آئی بی کالونی کراچی (آپ محمد نعیم بھائی، پی آئی بی کالونی میں رسالہ دیر سے ملنے کی شکایت اتفاق نیوز ایجنسی فون نمبر 7733755 سے کریں۔ عبدالرحمن ضیا شادمان لاہور۔ شوکت وحید ہری پور۔ سید مہر النساء مشتاق اسلام آباد۔ کاشر علی لبطی سیالکوٹ۔ محمد اسلم شاکر ہارون آباد۔ غیاث ارسلان ملک جھنگ صدر۔ زاہد حسین انصاری ٹنڈو آدم۔ محمد انیس شیخوپورہ۔ ادریس احمد کھاریاں چھاؤنی۔ روزینہ خان ڈگری سندھ۔ عبدالباری لورالائی۔ محمد صبور صادق اعوان ٹاؤن لاہور۔ رومان ظہیر راج گڑھ لاہور۔ عماد الرحمن گورایہ، رضوانہ احمد گورایہ گوجرانوالہ۔ عاطف بشیر احمد راہ والی۔ خولہ امجد ظہیر سیالکوٹ۔

آپریشن سیاچن۔ آخری قسط

سلیم خان گمّی

لیبارٹری تباہ ہوگئی

میجر تنویر کمرے میں داخل ہوا تو اُس کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ یقیناً وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

"سَر، آپ کچھ پریشان دِکھائی دیتے ہیں" کیپٹن اصغر خان نے کہا۔

"نہیں تو۔ پریشانی کی کیا بات ہے؟ تمہیں کچھ معلوم ہو تو ضرور بتاؤ" میجر نے کہا۔

"جب آپ میرے ساتھ ہوں تو مجھے پریشانی کا کالا چہرہ دِکھائی نہیں دیتا" کیپٹن نے انگریزی میں کہا۔

"تمہارا انگریزی بولنے کا انداز بہت خوبصورت ہے" میجر نے داد دی۔

"یہ بھی مَیں نے آپ ہی سے سیکھا ہے، سَر" کیپٹن بولا۔

"بناؤ نہیں۔ مجھے معلوم ہے، یہ تم نے ایک انگریز لیڈی ٹیچر سے سیکھا ہے، جب تمہارے ابّا جان لاہور چھاؤنی میں تھے اور تم پرائمری اِسکول میں پڑھتے تھے" میجر بولا۔

"آپ کو یہ بات کِس نے بتائی، سَر؟"

"تم نے۔ بھُول گئے؟"

وہ باتیں کر رہے تھے کہ خانساماں گرما گرم چائے لے آیا۔

"جناب، میں بناؤں یا آپ خود بنائیں گے؟" وہ بولا۔

"ہم خود بنائیں گے۔ کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے؟" کیپٹن نے پُوچھا۔

"ناشتا تو آپ تھوڑی دیر بعد کریں گے۔ ابھی تو آپ کے لیے بیڈ ٹی لایا ہوں" خانساماں بولا۔ وہ گول مٹول، گورا چِٹّا اور قدرے گنجا تھا۔ عمر ہو گی یہی کوئی چالیس برس۔ بُدھ مت کا ماننے والا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ پروفیسر کب واپس آئیں گے؟" پروفیسر رحمان جُو نے پُوچھا۔

"وہ بھی آنے ہی والے ہیں۔ یہیں ناشتا کریں گے" گول مٹول خانساماں بولا۔

ماہِ نو نے سب کے لیے چائے بنائی۔ پروفیسر رحمان جُو کے کپ میں چینی کے بجائے کینڈریل کی ایک گولی ڈالی کیونکہ

وہ شوگر کے مریض تھے۔ چائے کا گھونٹ بھر کے میجر تنویر خان نے کیپٹن اصغر خان سے کہا:

"میرا نام جیون سنگھ ہے۔ میں ڈوگرہ ہوں اور انسپکٹر پولیس ہوں۔ جموّں سے پروفیسر منور نجن اور پروفیسر ریشم سنگھ ورک کی حفاظت کے لیے آیا ہوں۔ یاد رکھو! میرا نام اِنسپکٹر جیون سنگھ ہے اور تم سب اِنسپکٹر من موہن ہو۔ تم بھی میرے ساتھ جموّں سے آئے ہو، پروفیسر کی حفاظت کے لیے۔"

"یس سر" کیپٹن نے کہا۔

"ہم باہر جائیں گے تو پولیس کی اِن وردیوں میں جائیں گے جو ہم نے اِس وقت پہن رکھی ہیں۔ اگر کوئی ہم سے کاغذ مانگے تو ہم کاغذ نہیں دِکھائیں گے۔ پُوچھنے والے سے کہیں گے کہ جموّں یا سری نگر سے رابطہ کرو۔"

"کیا مجھے بھی اپنا نام بدلنا ہو گا؟" پروفیسر رحمان جُو نے پُوچھا۔

"نہیں، جناب۔ آپ پروفیسر رحمان جُو ہیں۔ آپ اپنے دونوں دوستوں سے کہیں گے کہ وہ اِنسان دُشمن نہ بنیں اور جو منصوبہ وہ بھارتی فوج کی نگرانی میں تیّار کر رہے ہیں، اُسے نامکمل اور ادھورا چھوڑ دیں۔"

"اگر وہ نہ مانے تو پھر؟" پروفیسر رحمان جُو نے پُوچھا۔

"پھر مجھے بتا دیں۔ میں اُن سے عرض کروں گا کہ چھوڑیے اِس کام کو" میجر نے کہا۔

"اگر وہ پھر بھی نہ مانے تو؟" پروفیسر نے سوال کیا۔

"تو پھر، ہمیں اُن کی تجربہ گاہ کو نیست و نابود کرنا ہو گا" میجر بولا۔

"مگر وہاں تو بھارتی فوج کا کڑا پہرا ہو گا" لیڈی ڈاکٹر بولی۔

"یقیناً پہرا ہو گا، اور نہایت سخت ہو گا۔ تاہم ہمیں تجربہ گاہ تباہ کرنے کے لیے بھارتی فوج کے پہرے داروں سے لڑنا ہو گا" میجر نے کہا۔

"دو آدمی فوج سے کیا لڑیں گے؟" پروفیسر رحمان جُو نے مایوس لہجے میں کہا۔

"ہم دو نہیں، گیارہ ہیں۔ آپ نے سُنا ہو گا کہ ایک اکیلا دو گیارہ" کیپٹن اصغر خاں مسکرا کر بولا

"ہم دو نہیں تین ہیں۔ وقت آنے پر میں بھی لڑوں گی" لیڈی ڈاکٹر ماہِ نو بولی۔

"شاباش! مجھے آپ سے یہی اُمّید تھی۔ لیکن آپ تو صرف میرے علاج کے لیے آئی ہیں" پروفیسر بولا۔

"یہ تو میرا پہلا فرض ہے۔ لیکن ضرورت پڑے تو مسلمان عورت ہتھیار بند ہو کر میدانِ جنگ میں بھی اُتر سکتی ہے" ماہِ نو کے لہجے میں ایک خاص جذبہ تھا۔

"ویری گُڈ! حوصلہ بڑھا دیا آپ نے میرا" پروفیسر خُوش ہو کر بولا۔

"آپ کا نام لیڈی ڈاکٹر کرشنا کُماری ہے اور آپ نئی دہلی سے آئی ہیں، پروفیسر منور نجن اور پروفیسر ورک کی دیکھ بھال کے لیے" میجر تنویر بولا۔

خانساماں چوکیدار کے ساتھ اندر آیا اور بولا "صاحب، چوکیدار تین دِن کے لیے کھانے پینے کی چیزیں لے آیا ہے"۔

"ٹھیک ہے ناشتا تیار کرو۔ پھر دوپہر کا کھانا اور اِس کے بعد رات کا کھانا۔ پروفیسر منور نجن اور پروفیسر ورک آ جائیں تو ہمیں بتا دینا۔ اُن کو بتاؤ کہ اُن کی حفاظت کے لیے دو پولیس افسر آئے ہیں اور ایک لیڈی ڈاکٹر بھی ہے۔ میرا نام انسپکٹر جیون سنگھ، اُن کا نام سب انسپکٹر من موہن اور یہ ہیں لیڈی ڈاکٹر کرشنا کُماری۔ ہمارے یہ بزرگ بھی پروفیسر ہیں اور سری نگر سے آئے ہیں۔ وہ دونوں پروفیسر اِن کو جانتے ہیں۔ اب جاؤ اور ناشتا لے کر آؤ" میجر نے کہا اور خانساماں چوکیدار کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔ البتہ وہ برتن اُٹھانا بھُول گیا۔ شاید وہ پولیس کی وردی سے ڈر گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ناشتا آ گیا۔ جِس کمرے میں وہ بیٹھے تھے،

اس میں تین پلنگ تھے۔ تینوں مرد اُن پلنگوں پر دراز ہو گئے اور ماہِ نو دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اِس وقت نو بج رہے تھے۔ طے پایا کہ وہ دوپہر کے بارہ بجے تک آرام کریں گے اور اِس کے بعد ہال کمرے میں میٹنگ ہو گی۔

جب وہ بارہ بجے میٹنگ کر رہے تھے تو خانساماں نے آ کر بتایا کہ صبح جوگنگ کرتے ہوئے پروفیسر منور نجن کے ٹخنے میں موچ آ گئی تھی اور وہ ملٹری ہسپتال میں داخل ہو گئے ہیں۔ پروفیسر رشیم سنگھ ورک اُن کو ہسپتال چھوڑ کر فیکٹری چلے گئے اور اُن کو ناشتا وہیں بھجوایا گیا۔ اب چوکیدار دوپہر کا کھانا لے کر ہسپتال بھی جائے گا اور فیکٹری بھی۔ خانساماں جس جگہ کو فیکٹری بتا رہا تھا، وہ دراصل لیبارٹری یا تجربہ گاہ تھی جہاں وہ دونوں پروفیسر برف کے پہاڑوں یعنی گلیشیروں کو بم سے اُڑا کر طوفانِ نوح لانا چاہتے تھے۔

"اُن دونوں کو ہمارے مُتعلّق بتا دیا تھا یا نہیں؟" میجر نے پُوچھا۔

"نہیں، جناب۔ میری اُن سے ملاقات نہ ہو سکی۔ فوج کی گاڑی باہر سے ہی اُن کو ہسپتال اور پھر فیکٹری لے گئی۔"

"کوئی بات نہیں۔ شام کو ملاقات ہو جائے گی" میجر بولا۔

خانساماں چلا گیا تو میجر نے کہا "ہمارے پاس کل 24 گھنٹے ہیں۔ اِن چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر ہمیں اُن پروفیسروں کو قائل کرنا ہو گا کہ وہ اِنسانیت کے خلاف جُرم نہ کریں۔"

"وہ باز نہیں آئیں گے" پروفیسر رحمان جُو نے کہا۔

"ایسی صورت میں ہمیں کوئی اور ترکیب سوچنا ہو گی" میجر بولا۔

"مثلاً؟" پروفیسر رحمان جُو نے پُوچھا۔

"اُن کو اغوا کرنا یا ختم کرنا ہو گا" کیپٹن اصغر خاں نے کہا

"اور اِس لیبارٹری کا کیا بنے گا؟" ماہِ نو نے پُوچھا۔

"اِسے بھی تباہ کرنا ہو گا" میجر نے کہا۔

"اِس وقت ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" کیپٹن نے پُوچھا۔

"آپ جیپ میں لیڈی ڈاکٹر ماہِ نو، معاف کرنا، کرشنا کماری کو لے کر ملٹری ہسپتال جائیں اور ہاں، جا کر پروفیسر منور نجن کے نیند کا ٹیکا لگا کر آئیں" میجر نے کہا۔

لیڈی ڈاکٹر اپنے کمرے میں گئی اور ٹیکا اور سرنج وغیرہ لے آئی۔ کیپٹن نے اُسے پولیس کی جیپ میں بٹھایا اور چوکیدار سے چھاؤنی کا راستہ پُوچھ کر چل دیا۔ آدھ گھنٹے کے اندر وہ ملٹری ہسپتال میں تھے۔ لیڈی ڈاکٹر کرشنا کماری اور سب انسپکٹر من موہن پروفیسر منور نجن کے کمرے میں داخل ہوئے۔ پروفیسر لیٹا ہوا تھا۔ کمرے میں کوئی اور نہ تھا۔

"کیسے ہیں آپ، پروفیسر صاحب؟" سب انسپکٹر نے پُوچھا۔

"ٹھیک ہوں۔ بس ذرا ٹخنے میں درد ہے" پروفیسر بولا۔

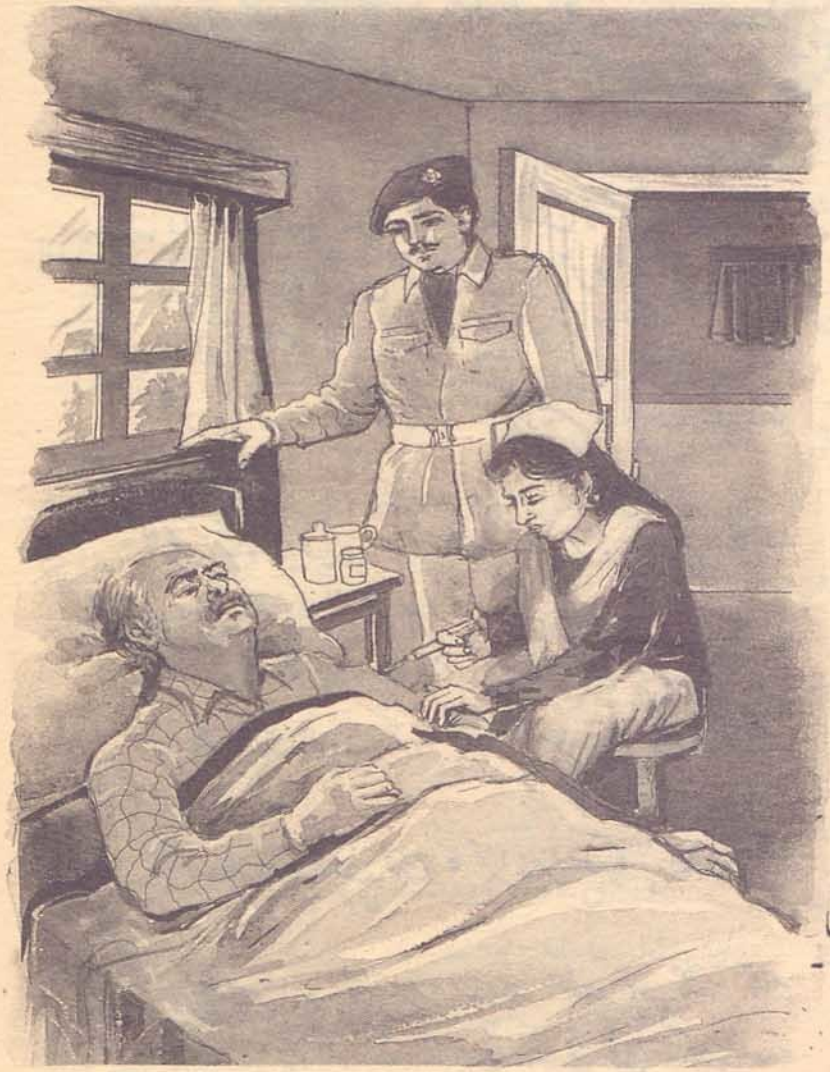

"آپ کے نیند کا ٹیکا لگانے آئی ہیں لیڈی ڈاکٹر کرشنا کماری"۔

لیڈی ڈاکٹر نے پروفیسر کے بے ہوشی کا ٹیکا لگایا اور کیپٹن اصغر خان کے ساتھ واپس چل دی۔ ریسٹ ہاؤس آ کر دونوں نے میجر کو بتایا کہ پروفیسر منورنجن کم از کم بارہ گھنٹے نیند کے مزے لوٹتے رہیں گے۔ اُن کی آنکھ آج آدھی رات کے بعد کھُلے گی۔

چاروں نے مِل کر کھانا کھایا اور پھر میجر اور کیپٹن جیپ میں بیٹھ کر قصبہ نوبرا اور چھاؤنی نوبرا دیکھنے کے لیے چل دیئے۔ قصبہ اور چھاؤنی دریائے نوبرا کے دونوں کناروں پر آباد ہیں۔ جب سیاچن گلیشیر کی برف پِگھلتی ہے تو پانی نیچان کی طرف بہ کر دریائے نوبرا میں گرتا ہے۔ یہ دریا پھر دریائے شیوک میں جا گرتا ہے۔ دریائے شیوک بلتستان میں آ کر دریائے سندھ میں شامل ہو جاتا ہے۔ قصبہ جیلو دریائے شیوک کے بائیں کنارے پر ہے۔

نوبرا کی وادی اب بہت بڑی چھاؤنی ہے۔ سیاچن گلیشیئر پر لڑنے والی بھارتی فوج کو اس چھاؤنی سے گولا بارود، غذائی سامان اور کمک پہنچائی جاتی ہے۔ یہاں بڑے بڑے ڈپو اور اِسٹور ہیں۔ ہوائی اڈّا بھی ہے۔ یہ چھاؤنی اِس لیے بہت بڑی بنائی گئی ہے کہ بھارت کسی وقت بھی پاکستان اور چین کے خلاف جنگ کا اعلان کر سکتا ہے۔ بھارت کے مقابلے میں پاکستانی فوج کی چھاؤنی سکردو میں ہے جو سیاچن سے بہت دُور ہے۔

چھاؤنی کا چکّر لگاتے ہوئے میجر تنویر اور کیپٹن اصغر نے درختوں میں گھری ہوئی اس ایک منزلہ سفید بلڈنگ کو بھی دیکھا جسے خانساماں فیکٹری کہتا تھا اور جو دراصل فوج کی تجربہ گاہ تھی۔ جب میجر کی جیپ گیٹ پر پہنچی اور اندر جانے لگی تو بھارتی فوج کے کیپٹن نے اُن کو رُکنے کا اِشارہ کیا۔

"ہم پروفیسر ریشم سنگھ ورک اور پروفیسر منورنجن کے باڈی گارڈ ہیں" میجر نے کہا۔

"درست، لیکن آپ ریسٹ ہاؤس میں اُن کی حفاظت کریں۔ یہاں اُن کی حفاظت کی ذِمّے داری ہماری ہے" گیٹ پر کھڑے کیپٹن نے کہا۔

"ہم اُن کو لینے آئے ہیں" کیپٹن اصغر خان نے کہا۔

"وہ ریسٹ ہاؤس تک فوج کی جیپ میں جائیں گے، پولیس کی جیپ میں نہیں" بھارتی فوج کے کیپٹن نے کہا۔

میجر تنویر اور کیپٹن اصغر سلام کیے بغیر جیپ موڑ کر واپس چلے گئے۔

"ہمیں آج رات کسی وقت یہاں آنا ہو گا، اسے تباہ کرنے کے لیے" میجر بولا۔

"کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ پروفیسر منورنجن اور پروفیسر ورک اپنے ہاتھوں سے اسے تباہ کر دیں؟" کیپٹن اصغر خاں نے کہا۔

"ناممکن۔ پروفیسر منورنجن تو کٹر ہندو ہے۔ وہ کیوں آمادہ ہو گا۔؟ پروفیسر ورک سِکھ ہے۔ وہ آمادہ ہو سکتا ہے۔ پروفیسر رحمان جُو کو اِسی لیے ساتھ لائے ہیں کہ وہ پروفیسر ورک سے بات کریں۔ ہمارے پاس پروفیسر ورک کے لیے ایک اور نسخہ بھی ہے۔ اسے بھی کام میں لائیں گے" میجر نے بتایا۔

"وہ نسخہ کیا ہے؟" کیپٹن نے پُوچھا۔

"کل بتاؤں گا۔ آج نہیں۔ نسخہ لیڈی ڈاکٹر ماہ نو کے پاس ہے۔"

جب وہ ریسٹ ہاؤس پہنچے تو پروفیسر رحمان جُو سو رہا تھا اور لیڈی ڈاکٹر ماہِ نو عُرف کرشنا کماری پروفیسر ورک کے کمرے میں تھی۔ ماہِ نو واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں گورمکھی میں لکھا ہوا ایک خط تھا "یہ خط پروفیسر ورک کی میز پر پڑا تھا، لیکن مجھے گورمکھی نہیں آتی۔" ماہِ نو نے خط میجر کو دے دیا۔ میجر نے اسے کھڑے کھڑے پڑھا اور پھر اپنی جیب میں ڈال لیا۔

"کیا لکھا ہے اِس میں؟" ماہِ نو نے پُوچھا۔

"پروفیسر کی بیوی پریت کور کا خط ہے۔ بھارتی پنجاب کے ایک قصبہ سنگرور سے آیا ہے۔ لکھا ہے کہ تم بہت یاد آتے ہو" میجر نے بتایا۔

"اور کیا لکھا ہے؟" کیپٹن اصغر خاں نے پُوچھا۔

"اور لِکھا ہے کہ میں جنم استھان بابا گرونانک جی مہاراج ننکانہ صاحب کی یاترا کرنا چاہتی ہوں۔ واہگورو میری خواہش پوری کرے"۔

"ننکانہ صاحب تو پاکستان میں ہے" ماہِ نو بولی۔

"ہاں، ننکانہ صاحب پاکستان میں ہے۔ پاکستان میں کافی سکھ رہتے ہیں۔ بلوچستان اور سندھ میں تو سکھوں کی بہت آبادی ہے" میجر نے بتایا۔

وہ سہ پہر کے بعد چائے پی کر فارغ ہوئے تھے کہ بھارتی فوج کی جیپ پروفیسر ورک کو چھوڑ کر چلی گئی۔ پروفیسر ورک اپنے کمرے سے ہو کر باہر آیا اور ریسٹ ہاؤس کے برآمدے میں کھڑا ہو گیا۔ میجر نے کھڑکی میں سے اُسے دیکھا اور ماہِ نو کو اِشارہ کیا۔ دونوں برآمدے میں آئے اور پروفیسر کو سلام کیا۔ پروفیسر ورک ساڑھے چھ فُٹ کا قد آور اِنسان تھا۔ عمر یہی کوئی 45 برس ہوگی۔ ڈاڑھی اور مونچھوں میں کہیں کہیں سفیدی آ گئی تھی۔ سَر پر کس کر پگڑی بندھی ہوئی تھی۔

"میرا نام جیون سنگھ ہے۔ میں پولیس اِنسپکٹر ہوں۔ جموّں کا رہنے والا ہوں۔ آپ کو اور پروفیسر منور نجن کو کشمیری مجاہدوں سے خطرہ ہے۔ مَیں اور میرا ایک سب انسپکٹر من موہن آپ کی حفاظت کے لیے آئے ہیں" میجر نے جلدی جلدی کہا۔

"آپ کی مہربانی۔ اور یہ کون ہے؟" پروفیسر نے لیڈی ڈاکٹر کی طرف اِشارہ کیا۔

"یہ لیڈی ڈاکٹر کرشنا کماری ہیں۔ آپ کی دیکھ بھال کے لیے آئی ہیں۔"

"لیکن مجھے تو کوئی بیماری نہیں ہے، انسپکٹر جی" پروفیسر بولا۔

"احتیاطاً اِن کو بھیجا گیا ہے" میجر نے کہا۔

"ان کی بھی مہربانی۔ میرا ساتھی پروفیسر بیمار ہے۔ اُس کے ٹخنے میں موچ آ گئی ہے۔ ہسپتال میں ہے۔ مَیں اُسے دیکھنے جاؤں گا۔ یہ بھی میرے ساتھ جانا چاہتی ہوں تو لے جاؤں گا" پروفیسر بولا۔

"آپ نہ جائیں۔ میں گئی تھی، نیند کا ٹیکا لگانے۔ وہ سوئے ہوئے تھے۔"

"آپ کہتی ہیں تو نہیں جاؤں گا۔ جب وہ سویا ہوا ہے تو میرے جانے کا کیا فائدہ؟" پروفیسر ورک بولا۔

"ایک اور صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں، سری نگر سے" میجر نے کہا۔

"کون ہیں وہ؟" پروفیسر ورک نے پُوچھا۔

"وہ برابر والے کمرے میں سوئے ہیں۔ آپ خود اُن سے مل لیں" میجر نے کہا۔

وہ تینوں اُس کمرے میں آئے جہاں پروفیسر رحمان جُو بیٹھے تھے۔ پروفیسر ورک نے پروفیسر رحمان جُو کو دیکھا تو گھبرا کر بولا "پروفیسر رحمان جُو، تم؟ تم تو پاکستان چلے گئے تھے؟"

"ہاں، میں پاکستان چلا گیا تھا اور آج ہی وہاں سے آیا ہوں، آپ سے ملنے کے لیے۔"

"مجھ سے ملنے کے لیئے؟ کیوں؟ کوئی خاص کام؟" پروفیسر ورک بولا۔

"آپ اور پروفیسر منور نجن آزاد کشمیر اور پاکستان کے عوام کی ہلاکت کے لیے جو کام کر رہے ہیں، اِسے ظلم کہا جائے گا، اِنسانیت کے خلاف ظلم۔ لاکھوں کروڑوں بے گناہ اِنسان مارے جائیں گے۔ جِس کی اجازت نہ اِسلام دیتا ہے نہ سکھ مذہب اور نہ ہندو مت۔ آپ صرف اِنعام کے لالچ میں اِنسانیت پر ظلم کریں گے۔"

"پروفیسر رحمان جُو، آپ لیٹ ہو گئے۔ پرسوں بموں میں ریڈیو ایکٹو پلوٹونیم ڈیوائس ڈال دی جائے گی۔ پرسوں دوپہر جنرل ٹنڈن کی موجودگی میں یہ کام ہو گا۔ آپ پہلے آ جاتے تو جو کہتے وہ کرتا۔ اس کے علاوہ میں آپ کی بات مان بھی لُوں تو پروفیسر منو رنجن بموں میں ڈیوائس ڈال دیں گے۔"

"یہ ڈیوائس کیا چیز ہے؟" میجر نے پوچھا۔

"یوں سمجھو کہ بم میں وہ مسالا ڈال دیا جائے گا جِس سے

بم چلے گا تو برف پانی بن جائے گی" پروفیسر ورک بولا۔

"یہ کام آپ اور پروفیسر منور نجن کے علاوہ کوئی اور بھی کر سکتا ہے یا نہیں؟" میجر نے پوچھا۔

"ہمارے علاوہ یہ کام کوئی اور نہیں کر سکتا۔ لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟" پروفیسر نے اچانک سوال کیا۔

"ویسے ہی" میجر نے کہا۔

"میرا خیال ہے، مجھے بھارتی فوج کو بتانا ہو گا کہ پروفیسر رحمان جو نوبرا ویلی کے ریسٹ ہاؤس میں پہنچ گئے ہیں" پروفیسر ورک نے سوچ کر کہا۔

"سر، ہم کس مرض کی دوا ہیں؟ سب انسپکٹر من موہن، پروفیسر رحمان جو کو پکڑ کر برابر والے کمرے میں بند کر دو۔ بھاگنے کی کوشش کرے تو گولی مار دو" میجر تنویر نے کیپٹن اصغر خان کو حکم دیا۔

کیپٹن پروفیسر رحمان جو کو دھکیلتا ہوا اُس کمرے کی طرف لے گیا جو ماہِ نو کے لیے مخصوص تھا۔

"مجھے پھر بھی فوج کو اطلاع دینی ہو گی۔ میں سیکورٹی کے میجر کمار کو فون کرتا ہوں" پروفیسر بولا۔

"سر، آپ کا ٹیلی فون میں نے خود چیک کیا تھا۔ وہ خراب ہے اور کل ٹھیک ہو گا۔ رپورٹ درج ہو چکی ہے۔" میجر نے کہا۔

اِسی اثنا میں کیپٹن اصغر خاں واپس آ گیا۔ اُس نے کہا "پروفیسر کو کل پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔"

"نہیں۔ اُسے میجر کمار کے حوالے کریں گے۔ وہ اُسے گولی مار کر لاش ٹھکانے لگا دے گا۔ آیا تھا مجھے سمجھانے" پروفیسر غصّے سے بولا۔

خانساماں دودھ میں اوولٹین ڈال کر لے آیا۔ پروفیسر اُسی کُرسی پر بیٹھ کر دودھ پینے لگا جس پر ذرا پہلے پروفیسر رحمان جو بیٹھا تھا۔

"اگر رحمان جو نوبرا میں ہے تو اس کا بیٹا اکبر جو بھی نوبرا میں ہو گا۔ میجر کمار نے مجھے بتایا تھا کہ یہ دونوں دہشت گرد ہیں" دودھ پی کر گلاس سے کھیلتے ہوئے پروفیسر ورک بولا "وہ مجھے اور پروفیسر منور نجن کو قتل کرنے کے لیے آ سکتا ہے، اپنی ٹولی کے ساتھ۔"

"ہمیں سرکار نے آپ دونوں کی حفاظت کے لیے اِسی لیے بھیجا ہے سر" میجر بولا۔

اِسی اثنا میں چوکیدار اندر آیا اور پروفیسر ورک سے مخاطب ہو کر بولا "صاحب، باہر جیپ آئی ہے۔ آپ ہسپتال جائیں گے، دوسرے پروفیسر کو دیکھنے کے لیے۔"

"وہ سویا ہوا ہے۔ میں نہیں جاؤں گا جیپ واپس بھیج دو۔" چوکیدار واپس چلا گیا۔

"آپ دونوں کو سرکار نے بھیجا ہے تو ضرور میری اور منور نجن جی کی جان کو خطرہ ہو گا" پروفیسر ورک پریشان ہو کر بولا۔

"ابھی تک تو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ جب ہو گا تو اس کا مقابلہ کریں گے" میجر نے لفظ مقابلہ پر زور دے کر کہا۔

پروفیسر نے کہا "پرسوں شام کو ہم آرمی کے سپرد بم کر کے چلے جائیں گے"۔

شام ہو گئی تھی اور پرندے درختوں پر شور مچا رہے تھے۔ پروفیسر ورک کُرسی پر سے اُٹھا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ اُس کا کمرا ریسٹ ہاؤس کے گیٹ سے ہٹ کر تھا۔ اگر کوئی اس سے ملنے کے لیے آتا تو اُسے میجر اور ماہِ نو کے کمروں کے سامنے سے گزرنا پڑتا۔ اگرچہ سردی تھی لیکن میجر نے اپنا دروازہ کھلا رکھا تھا۔ جب خانساماں کھانا لے کر آیا تو میجر نے اُسے سو روپے دے کر کہا کہ اگر کوئی پروفیسروں سے ملنے کے لیے آئے تو پہلے اُسے ہمارے پاس لانا۔

سو روپے جیب میں ڈال کر خانساماں سر ہلاتا ہوا چلا گیا۔ ماہِ نو نے اپنا اور پروفیسر رحمان جو کا کھانا اٹھایا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میجر کھانا کھاتے ہوئے بولا "پروفیسر ریشم سنگھ ورک کی بیوی پاکستان پہنچ چکی ہے۔ پروفیسر کو اس سے بے پناہ محبت ہے۔ اُن کی کوئی اولاد نہیں ہے۔"

"تو یہ ہے وہ نسخہ جس کا آپ نے ذِکر کیا تھا" کیپٹن نے کہا۔

"گورمکھی میں لکھا ہوا خط اس بات کی رسید ہے کہ پریت کور ننکانہ صاحب پہنچ گئی ہے اور اب وہ کبھی واپس نہیں جائے گی۔ ساری زندگی ننکانہ صاحب ہی میں رہے گی۔"

وہ یہ باتیں کر رہے تھے کہ ماہِ نو برتن لے کر آ گئی۔ میجر نے اُس سے پُوچھا "پروفیسر رحمان جُو کیسے ہیں؟"

"مزے میں ہیں۔ اُنہوں نے کھانا کھالیا ہے اور مَیں نے اُن کے اِنسولین کا ٹیکا لگا دیا ہے۔ وہ ساری بات سمجھ گئے ہیں" ماہِ نو نے بتایا۔

"آج کی رات بہت کڑی ہے" میجر بولا۔

"میرا دِل کہتا ہے کہ آج رات ضرور کچھ ہو گا" کیپٹن بولا۔

"مجھے آپ دونوں کے سامنے ایک اعتراف کرنا ہے" ماہ نو بولی۔

"کیجئے" میجر نے کہا۔

"مَیں نے پروفیسر منو رنجن کے عارضی نیند کے بجائے غلطی سے ہمیشہ کی نیند کا ٹیکا لگا دیا" وہ بولی۔

"وہ تو مَر چکا ہو گا" میجر بولا۔

"جی ہاں۔ لیکن پتا صبح چلے گا" ماہِ نو بولی۔

اُس نے ابھی بات ختم کی تھی کہ پروفیسر ورک کے قدموں کی چاپ سُنائی دِی۔ میجر اُٹھ کر برآمدے میں آیا اور پروفیسر ورک سے بولا "سَر، زحمت نہ ہو تو ہمارے پاس بیٹھ جائیں۔"

"نہیں۔ یہ وقت سیر کا ہے۔ باتیں کرنا چاہتے ہو تو میرے ساتھ آؤ۔ لان میں گھومتے ہیں" وہ بولا

چاروں لان میں چلے گئے اور دیر تک گھومتے رہے۔ جب سردی بڑھ گئی تو واپس کمروں کا رُخ کیا۔ پروفیسر ورک اپنے کمرے میں جانے کی بجائے میجر کے کمرے میں آ کر بیٹھ گیا۔ میجر نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا اور بولا "پروفیسر صاحب، آپ کی بیوی ننکانہ صاحب پہنچ گئی ہے۔ جو خط بھارت کے کسی ڈاک خانے سے پوسٹ ہوا، وہ دراصل ننکانہ صاحب میں بیٹھ کر لکھا گیا، اور ہم آپ کو لینے کے لیے آئے ہیں۔"

"تو کنٹرول اور کرنل قاضی نے جو کہا وہ کر دکھایا۔ پریت کور اب پاکستان میں ہے اور انسپکٹر جیون سنگھ اور سب انسپکٹر من موہن پاکستانی فوج کے میجر تنویر اور کیپٹن اصغر خان ہیں اور مجھے لینے آئے ہیں؟"

"یقیناً۔ اور یہ ہیں لیڈی ڈاکٹر ماہِ نو" میجر نے کہا۔

"پروفیسر منو رنجن کا کیا بنے گا؟" پروفیسر ورک نے پُوچھا۔

"وہ بیمار ہیں اور ہسپتال میں ہیں۔ اُن کے زہر کا ٹیکا لگا دیا گیا ہے۔"

"وہ اِسی قسم کے ٹیکے کا حق دار تھا" پروفیسر ورک بولا۔

"اب ہمیں کیا کرنا چاہئے، پروفیسر صاحب؟ وقت بہت کم ہے" میجر نے پُوچھا۔

"مجھ سے مشورہ نہ لیں۔ اپنی مرضی کریں" پروفیسر بولا۔

"میرے خیال میں ہمیں لیبارٹری کو تباہ کرنا ہو گا۔ ابھی اِسی وقت" میجر بولا۔

"مجھے آپ سے اتفاق ہے" پروفیسر بولا۔

"آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہو گا تاکہ گیٹ کے اندر جا سکیں" کیپٹن اصغر خان نے کہا۔

"میں تیار ہوں" پروفیسر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"ماہِ نو، آپ پروفیسر رحمان جُو کے پاس ٹھہریں۔ ہم تجربہ گاہ سے فارغ ہو کر یہیں آئیں گے" میجر بولا اور پروفیسر ورک اور کیپٹن اصغر خان کے ساتھ جیپ کی طرف چل دیا۔

آدھ گھنٹے کے بعد جب وہ لیبارٹری کے گیٹ پر پہنچے تو پروفیسر ورک اور پولیس انسپکٹر کو دیکھ کر گیٹ کیپر نے گیٹ کھول دیا۔ لیکن اس نے پروفیسر سے ایک رجسٹر پر دستخط کروائے۔

وہ آتش گیر مادہ ساتھ لائے تھے۔ دو گھنٹے کے اندر اندر اُسے لیبارٹری کے کمروں میں رکھ کر وہ باہر گیٹ پر آ گئے۔ عین اس وقت ان کے کانوں میں فائرنگ کی آوازیں آئیں۔

یہ آوازیں ریسٹ ہاؤس کی طرف سے آ رہی تھیں۔ لیبارٹری سے ایک میل دُور آ کر میجر نے مائیکرو ویو کے ذریعے آتش گیر مادے میں آگ لگائی۔ چند سیکنڈ میں پوری لیبارٹری آگ کے گولے میں تبدیل ہو گئی اور ہر طرف روشنی پھیل گئی۔ اس کے بعد لیبارٹری کا اُفق سُورج کی طرح چمک کر اتھاہ اندھیرے میں ڈوب گیا اور اس طرح بھارتی فوج کا منصوبہ خاک میں مل گیا۔

جب وہ ریسٹ ہاؤس پہنچے تو چوکیدار نے بتایا کہ کشمیر کے مسلمان دہشت گرد آئے تھے۔ اُنہوں نے فائرنگ کی اور پھر لیڈی ڈاکٹر اور ایک بُوڑھے آدمی کو ساتھ لے کر چلے گئے۔

چوکیدار نے ابھی بات ختم نہ کی تھی کہ ملٹری کا ایک ٹرک گیٹ پر آ کر کھڑا ہوا۔ کیپٹن فائر کرنے والا تھا کہ ماہِ نو چلّائی "فائیر نہ کرنا! اکبر جُو لینے آیا ہے۔ جلدی کرو!"

"میجر نے سو روپے کا نوٹ چوکیدار کو دیا اور بولا "خاموش رہنا۔"

"جی، صاحب جی" نوٹ جیب میں ڈالتے ہوئے چوکیدار بولا۔

"تمام فوج لیبارٹری کی طرف بھاگی چلی جا رہی ہے۔ ہمیں خدا نے فرار کا موقع دیا ہے۔"

میجر تنویر نے کہا اور جیپ اسٹارٹ کر کے ملٹری ٹرک کے آگے لگا دی۔ اُس کا رُخ چھور بٹ کی طرف تھا۔

☆ ختم شُد ☆

ناشُکری

رباب، نشتر ہسپتال ملتان

آج میں سڑک کے کنارے اُداس کھڑا ہوں اور حسرت سے سوچ رہا ہوں کہ الٰہی یہ کیا ہو گیا؟ آخر مجھے کس بات کی سزا ملی ہے؟ مجھ سے کیا گناہ ہو گیا تھا؟ "پھر جیسے میرے اندر سے آواز آئی "ہاں، گناہ تو تم سے بہت بڑا ہوا ہے۔ ناشُکری اور کُفرانِ نعمت کا گناہ۔" اور میرا سَر ندامت سے جُھک گیا ہے۔

میرا تعلّق ایک درمیانہ درجے کے گھرانے سے ہے۔ مجھ سے بڑی ایک بہن اور ایک تین سالہ چھوٹا بھائی ہے۔ میں اپنے والدین کا سب سے لاڈلا بیٹا تھا۔ وہ میری ہر جائز خواہش پوری کرتے تھے۔ میرے ابّو ایک نیک اور ایمان دار سرکاری افسر تھے۔ اِس لیے ہمارے گھر میں خُدا کی رحمت و برکت تھی۔ مَیں اور میرے بہن بھائی شہر کے اچھّے اِسکول میں پڑھتے تھے۔ میں بہت خُوش تھا۔

مگر پھر نہ جانے کیا ہوا۔ شیطان نے جیسے میرے دِماغ میں ڈیرا جما لیا۔ میری کلاس میں چند لڑکے بہت امیر گھرانوں کے تھے۔ میں اُن سے مرعوب ہو گیا۔ میرا دِل چاہنے لگا کہ میں بھی بہت امیر ہو جاؤں اور پجیرو گاڑی میں گھوموں پھروں۔ "کاش! ایسا ہو جائے۔ آخر اللہ میاں نے اتنی ساری نعمتیں اُن ہی لڑکوں کو کیوں دی ہیں؟ میرے پاس یہ سب کچھ کیوں نہیں؟" میں سوچتا اور رنجیدہ ہو جاتا، حال آں کہ میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ گھر تھا، ٹی وی تھا، فریج، ریڈیو وغیرہ تھے، اور سب سے بڑھ کر ماں باپ اور بہن بھائیوں کی مُحبّت تھی۔ لیکن ان دِنوں میری آنکھوں پر ایسی پٹّی بندھ گئی تھی کہ مجھے اپنے پاس خُدا کی کوئی نعمت دِکھائی ہی نہ دیتی تھی۔ میں روز بہ روز خواہشوں کی دَلدَل میں پھنستا چلا گیا اور اپنے پیارے رب سے شِکوے شکایت کرنے لگا۔

پھر میں نے امّی ابّو سے مختلِف قیمتی چیزوں کی فرمائشیں شُروع کر دیں، حالانکہ میں جانتا تھا کہ اتنی قیمتی اشیاء میرے والدین کی بساط سے باہر ہیں۔ پھر بھی میں ضد کرتا۔ میرا لہجہ والدین سے بات کرتے وقت بہت سخت ہوتا۔ میں اِتنا بدمزاج اور چڑچڑا ہو گیا تھا کہ میرے بہن بھائی مجھ سے بات کرتے ڈرنے لگے۔ مجھے اپنے گھر کی کوئی چیز اچھّی نہ لگتی، اور میں دِن رات شان دار محلّوں کے خواب دیکھتا۔ کاش! میں اس وقت اپنی امّی کی آنکھوں میں چھائی اُداسی کو دیکھ لیتا۔

خُدا کو شاید میرا یہ رویّہ پسند نہ آیا۔ سیلاب کے ایک بڑے ریلے نے میرے شہر کا رُخ کر لیا۔ میرا خیال تھا کہ شاید ہمارے شہر کو بچا لیا جائے گا۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اِعلان کیا گیا کہ تمام لوگ محفوظ مقامات پر چلے جائیں کیوں کہ سیلاب کا پانی شہر میں داخل ہونے والا ہے۔

ہمارا گھر ایک منزلہ تھا۔ ابّو نے کہا کہ سامان کی بجائے جان بچانے کی فکر کرنی چاہیے۔ لہٰذا امّی نے زیورات اور نقدی بیگ میں رکھّی اور ہم ابّو کے دوست کے گھر چلے گئے۔ اُن کا مکان تین منزلہ تھا۔ گیارہ بجے کے قریب سیلاب کا پانی شہر میں تباہی مچانے لگا۔ گھروں میں تین سے چار فُٹ تک پانی بھر گیا تھا۔

15 گھنٹے بعد سیلاب کا ریلا شہر سے گُزر گیا اور پانی اُترنا شُروع ہو گیا۔ ہم بھی اپنے گھر واپس آ گئے۔ اوہ! میرے خُدا! ہمارا سارا سامان خراب ہو گیا تھا اور پورا گھر گندگی اور کیچڑ میں لتھڑے ہوئے کھنڈر کی مانند لگ رہا تھا۔ امّی نے تو وہیں بیٹھ کر رونا شُروع کر دیا۔ ابّو بھی نہایت افسردہ تھے۔ پھر بھی اُنھوں نے ہم سب کو تسلّی دی۔ امّی آنسو پونچھتی ہوئی باجی کے ساتھ گھر کی صفائی میں لگ گئیں۔ اور مَیں.....؟

میں سڑک کے کنارے کھڑا یہ سوچ رہا ہوں "الٰہی! یہ کیا ہو گیا؟ کیا مجھے میری ناشکری کی سزا ملی ہے؟" میں نے خُدا کی نعمتوں کی ناشُکری کی تھی، اِس لیے خُدا نے مجھ سے اپنی نعمتیں واپس لے لیں۔ آج مجھے اپنا گھر اور وہ تمام چیزیں بہت قیمتی لگ رہی تھیں جنہیں میں بے وقعت سمجھتا تھا۔ "اب کیا ہو گا؟ اتنا سارا سامان دوبارہ کیسے آئے گا؟" مَیں نے بُڑبڑاتے ہوئے کہا۔ نااُمیدی اور مایوسی کے سیاہ بادل میرے ذہن پر چھانے لگے۔ آنسو میرے رخساروں پر بہنے لگے۔ مجھے یُوں لگا جیسے غم کی شِدّت سے میرا دِل پھٹ جائے گا کہ اچانک کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ مُڑ کر دیکھا تو پیچھے باجی کھڑی تھیں۔

وہ میرے قریب آئیں اور کہنے لگیں "خُدا کی نعمتوں کی ناشُکری کرنے کا گناہ تو تم کر ہی چکے ہو۔ اب خُدا کی ذات سے مایوس ہونے کا گناہ بھی کرنا چاہتے ہو؟ مایوسی کفر ہے، میرے بھائی۔ خُدا اپنے بندوں سے بہت پیار کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ ہمارا امتحان لے رہا ہو۔"

میں نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا "باجی، آپ پریشان نہیں ہیں؟"

باجی نے مُسکرا کر جواب دیا "نہیں، میرا خُدا پر ایمان بہت مضبوط ہے۔ تم دیکھنا، وہ دوبارہ ہم پر اپنے کرم اور نعمتوں کے دروازے کھول دے گا۔ وہ بہت غفور الرحیم ہے۔" پھر وہ پُرعزم لہجے میں بولیں، "میرے بھائی، ہم نہ صرف اپنے گھر کی بلکہ پورے شہر کی تعمیر کے کاموں میں حِصّہ لیں گے اور حوصلہ ہارے ہوئے لوگوں کا حوصلہ بڑھائیں گے۔ ہے نا؟" اُنہوں نے میرا کندھا تھپتھپایا اور اندر چلی گئیں۔

اور مجھے یُوں لگا جیسے میرے ذہن سے مایوسی کے بادل چھٹ گئے ہیں اور اُمّید کی کِرن نے میرے دِل و دماغ کو روشن کر دیا ہے۔ مَیں نے آسمان کی طرف دیکھا اور کہا "بے شک! میرے مولا! تو رحیم و کریم ہے۔ مجھے معاف کر دے۔ (پہلا اِنعام: 50 روپے کی کتابیں)۔

کار آمد مشغلہ

لعل بخش شیخ، مانجھی پور

یہ اُن دِنوں کی بات ہے جب ہم دسویں جماعت میں پڑھتے تھے اور ہماری ڈھائی مہینے کی گرمیوں کی چُھٹّیاں تھیں۔ اِن چُھٹّیوں میں ہم ہر دفعہ اپنی خالہ کے یہاں شکار پور جایا کرتے تھے۔ وہاں ہمارا ایک ہم عمر دوست تھا جس کا نام حامد تھا۔ اگر کبھی اتفاق سے ہم نہ جاتے تو وہ آجاتا۔ لیکن اِس دفعہ وہ اپنے چچا کی علالت کی وجہ سے اپنے امّی ابّو کے ساتھ دوسرے شہر گیا ہوا تھا۔ لہٰذا اِس دفعہ ہم شکار پور نہیں جا رہے تھے۔ ہمارے اِسکول کا دوست خیر محمد بھی اِس دفعہ اپنے ماموں کے یہاں دوسرے شہر چُھٹّیاں گزارنے گیا ہوا تھا اور ہماری گلی کے لڑکوں سے ابھی شناسائی نہیں ہوئی تھی کیوں کہ ہم اِس مُحلّے میں نئے نئے آئے تھے۔

چُناں چہ اِس دفعہ چُھٹّیوں میں ہم بڑے بور ہو رہے تھے اور کوئی مشغلہ ڈھونڈ رہے تھے جِس میں ہمارا دِل لگ جائے۔ بوریّت دُور کرنے کے لیے ہم نے کہانیوں کی کتابیں پڑھنا شُروع کیں لیکن اُن سے بھی ہمارا دِل جلد ہی بھر گیا۔ کہانیاں لکھنے کا خیال اِس لیے نہیں آیا کہ ہمارے پاس ایسا شان دار دِماغ نہیں تھا جِس میں اچھوتے خیالات آتے۔ ہمارے دِماغ میں تو بقول ہماری باجی کے بھوسا بھرا ہوا ہے۔ تو یہ کام بھی ہم نہ کر سکے۔ پھر خیال آیا کہ چلو ٹکٹ جمع کرتے ہیں۔ لیکن یہ شوق ہمیں بہت مہنگا لگا۔ اِس لیے یہ کام بھی ہم سے نہ ہو سکا۔

ایک دِن شام کو ہم اپنے صحن میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ ہماری چھٹی حِس نے اپنا کام کر دِکھایا۔ ہماری نظر ایک دَم کیاری کی طرف اُٹھ گئی جو عرصے سے اُجاڑ پڑی تھی اور جو پودے وہاں لگے تھے، وہ بھی ہماری توجّہ اور محبت نہ پاکر بڑے غم گین نظر آ رہے تھے۔ پس پھر کیا تھا۔ ہمارے ذہن

میں ایک خیال آیا اور ہم اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اب ہمیں ایک دِلچسپ اور کار آمد مشغلہ مِل گیا تھا۔ ہم بازار سے کُھرپی خرید لائے اور کیاری کو کُھودنا شروع کر دیا۔ پھر اِس میں کھاد لاکر ڈالی اور اس کے بعد بازار سے سبزیوں کے بیج لا کر بو دیئے۔ اِس کے بعد ہم روزانہ صُبح شام کیاری میں پانی دیتے اور اس کا بہت خیال رکھتے۔ ہمارا زیادہ وقت کیاری کی دیکھ بھال میں گزرتا تھا۔ دیکھتے دیکھتے اِن بیجوں سے ننھے ننھے پودے پھوٹنے لگے۔ اب تو ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ ہم پھولے نہ سما رہے تھے۔ اُدھر پودے پھوٹتے تھے اور اِدھر ہمارے چہرے پر خوشی پھوٹتی تھی۔ چُھٹیوں کا پتا ہی نہ چلا۔ پلک جھپکتے ہی گزر گئیں۔

اور پھر ہمارے اِسکول کُھل گئے۔ اب ہم صبح کیاری کو پانی دے کر اِسکول جاتے۔ اِسکول سے واپس آکر کچھ دیر آرام کرنے کے بعد ہوم ورک کرتے اور پھر کیاری کی دیکھ بھال میں لگ جاتے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پودے بڑے ہو گئے اور اُن میں سبزیاں آنے لگیں۔ یُوں ہمیں اپنی محنت کا پھل مِل گیا۔

ساتھیو! آپ بھی اپنا فارغ وقت بے کار نہ گنوایئے بلکہ اِس مفید اور کار آمد مشغلے کو اپنایئے۔ اِس سے آپ کا بھی فائدہ ہو گا اور مُلک بھی سَرسبز ہو جائے گا۔

(دوسرا اِنعام: 45 روپے کی کتابیں)۔

عِلم کی شمع روشن کرو

فقیہہ رضوی، لاہور

چُھٹیوں کے لمبے لمبے دِن کاٹے نہ کٹتے تھے۔ ہر وقت یہی سوچتے رہتے کہ کوئی کام کرنا چاہیئے۔ پھر ایک دن ہمارے ذہن میں ماسی بشیراں (جو ہمارے گھر کام کرتی ہے) کی بیٹی رضیہ کو پڑھانے کا خیال آیا۔

اگلے دِن ہم نے رضیہ سے پُوچھا "تمہیں پڑھنے کا شوق ہے؟"

ہماری بات سُن کر اُس نے سَر جُھکا لیا اور بولی "باجی، جب ابّا زندہ تھا تو میں پڑھنے جاتی تھی۔ دو کلاسیں بھی پڑھی ہیں۔ پھر جب چار سال پہلے وہ مَر گیا تو امّاں نے مجھے اِسکول سے اُٹھا لیا تاکہ میں کام کاج کروں۔"

ہم نے کہا "کوئی بات نہیں، رضیہ۔ کل سے میں تمہیں پڑھاؤں گی۔"

شام کو ہم اپنی سہیلی کے گھر سے اُس کے بھائی کی پُرانی کتابیں لے آئے۔ بھائی جان نے ہمیں کاپیاں لا کر دے دیں، اور دوسرے دن جب رضیہ آئی تو ہم اُسے پڑھانے لگے۔ لیکن ماسی بشیراں نے اعتراض کیا۔ کہنے لگی "باجی، تم اِسے پڑھاؤ گی تو کام میں میری مدد کون کرے گا؟ اور پھر گھر کے بھی سَتّر خرچے ہوتے ہیں۔ اور کچھ نہیں تو یہ دو، ڈھائی سو کی مدد تو کرتی ہے۔ مجھے اتنے روپوں کا گھاٹا ہو گا۔"

امّی نے ماسی کو سمجھایا تو اُس نے کہا "تمہیں نہیں پتا۔ مجھے بھی بڑا شوق ہے کہ میری بیٹی پڑھ لکھ جائے، اور پھر کسی اِسکول میں اُستانی لگ جائے۔ لیکن جب سے اس کا ابّا مَرا ہے، سارے گھر کا بوجھ مجھ پر آ پڑا ہے۔ اِس سے چھوٹے بھی چار بہن بھائی ہیں، اور گھر کا کرایہ بھی دینا ہوتا ہے۔"

آخر امّی اور بھائی جان کے سمجھانے پر ماسی بشیراں اِس بات پر راضی ہوئی کہ صبح کے وقت رضیہ کام میں اُس کی مدد کرے گی اور شام کو دو گھنٹے پڑھا کرے گی۔ اس طرح ماسی کی آمدنی پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

ہم رضیہ کو حساب، اُردو اور اِنگلش پڑھاتے۔ چند دن پڑھا کر ہم نے دیکھا کہ رضیہ اچھّی خاصی ذہین ہے اور جلدی سیکھ لیتی ہے۔ ماسی بشیراں نے ہمارے سمجھانے پر چُھٹیوں کے بعد رضیہ کو شام کی شفٹ میں ایک اِسکول میں داخل کرا دیا۔

امّی نے دیکھا کہ ماسی بشیراں کا ہاتھ تنگ ہے تو اُنہوں نے

اُس کی مالی امداد کی، اُس کی تنخواہ میں اِضافہ کر دیا اور رضیہ کی کتابوں اور کاپیوں کا ذِمّہ بھی لے لیا۔

ہمیں اِس بات کی خوشی ہے کہ ہم نے چھٹّیوں میں علم کی شمع روشن کی اور ایک مفید کام کیا۔ اگر سب لوگ چھٹّیوں میں کسی اَن پڑھ کو پڑھائیں تو ہمارے مُلک سے جہالت دُور ہو سکتی ہے۔

رضیہ باقاعدگی سے اِسکول جاتی ہے۔ ماسی بشیراں بھی بہت خوش ہے۔ وہ رضیہ کو پڑھتے دیکھتی ہے تو اُس کی آنکھوں میں چمک آ جاتی ہے، اُمّید کی چمک۔

(تیسرا اِنعام: 40 روپے کی کتابیں)

ہماری توبہ

عامر شہزاد، ساہیوال

یہ واقعہ ہمارے ایک رِشتے دار کے ساتھ پیش آیا۔ اُنہی کی زبانی سُنئے:

بچپن میں جہاں ہمارے ساتھیوں نے مختلف قسم کے شغل اختیار کر رکھّے تھے، وہاں ہم نے کبوتر بازی کا شغل پال رکھا تھا اور یہ شوق دیوانگی کی حد کو چھُو چُکا تھا۔ گھر کے لوگ ہمارے اِس شغل سے تنگ آ چکے تھے۔ مُحلّے والے الگ شکایتوں کا تانتا باندھے رکھتے۔ مگر ہم نے اِن تمام رکاوٹوں کے باوجود کبوتر بازی کا شغل ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

ہر روز صُبح منہ اندھیرے اُٹھنا، کابک کھول کر کبوتر اُڑانا، ہاہو کا اودھم مچانا مگر آہ! ہماری زندگی کا یہ دِل کش دور نہایت مختصر ثابت ہوا۔ ایک کم بخت بلّی نہ جانے کہاں سے آ ٹپکی اور ہمارے ارمانوں کا خُون کر گئی۔

ایک روز حسبِ معمول صبح سویرے ہم کابک کے قریب گئے تو اُس کا دروازہ ٹوٹا ہوا تھا۔ زمین پر بے شُمار پَر پڑے ہوئے تھے۔ دِل دھک سے رہ گیا۔ دروازہ کھول کر دیکھا۔ اندر کبوتروں کے دو جوڑے خُون میں لت پت پڑے تھے۔ اُن کے گلے یوں کٹے ہوئے تھے جیسے کسی نے پوری بے رحمی سے ذبح کیا ہو۔ ہماری آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے۔ جو کبوتر سہمے بیٹھے تھے، اُنہیں گِنا۔ ایک کبوتر کم تھا۔ گویا حملہ آور ایک کبوتر کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ ہم سمجھ گئے کہ یہ ساری کارستانی بلّی صاحبہ کی ہے۔

بلّی کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ کبوتروں کو گردن سے دبوچ کر ہلاک کرتی ہے۔ مارے غُصّے کے ہماری حالت غیر ہونی شُروع ہو گئی۔ جِسم غم و غُصّہ سے تھرتھرانے لگا۔ دِل میں بلّی کو ہزار صلواتیں سناتے ہوئے اُس کی تلاش شُروع کر دِی، مگر وہ بھی مکّاری میں لومڑی سے کم نہ تھی۔ رات بھر جاگ کر انتظار کرتے رہے مگر وہ نہ آئی۔

ایک کبوتر باز دوست کو یہ واقعہ سُنایا تو اُس نے ہمیں ایک ترکیب بتائی۔ کہنے لگا کہ گوشت میں زہر مِلا کر چھت پر رکھ دو۔ بلّی زہریلا گوشت کھا کر مَر جائے گی اور اِس طرح تمہیں اِس سے نجات مِل جائے گی۔ ہم اِسی وقت بازار سے ایک پاؤ گوشت لائے اور اُس میں زہر مِلا کر چھت پر رکھ آئے۔ دِل میں خوش تھے کہ دیکھیں، اب یہ کم بخت کیسے بچے گی۔ اُس رات خوب گھوڑے بیچ کر سوئے۔

اگلی صبح نیند سے بیدار ہوتے ہی چھت کی طرف بھاگے کہ جا کر بلّی کی لاش اٹھائیں۔ چھت پر پہنچے تو پہلی نظر کابک پر پڑی۔ اس کا دروازہ ٹوٹا ہوا تھا۔ دھڑکتے دِل کے ساتھ قریب گئے۔ آہ! دو کبوتر فرش پر پڑے آخری سانسیں لے رہے تھے۔ ابھی ہم ان کی حالت پر ماتم کر رہے تھے کہ پڑوس کی ایک عورت ہمارے گھر آئی اور لگی ہمیں صلواتیں سنانے۔ "او ظالم! یہ تم نے کیا کیا؟ ہماری اصیل مرغی کو زہر دے کر ہلاک کر دیا۔"

یہ سُن کر ہمارے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ چھت پر جا کر اُس جگہ کو دیکھا جہاں ہم نے زہریلا گوشت بلّی کے شکار کے لیے رکھّا تھا۔ وہاں ہماری آنکھوں نے ایک دِل خراش منظر

دیکھا۔ ایک عدد مُرغا اور تین عدد مرغیاں مُردہ پڑی تھیں۔ ہم فوراً سمجھ گئے کہ بلّی کی بجائے پڑوسن کی مُرغیوں نے زہریلے گوشت کی دعوت اُڑائی تھی۔ ہم نے پڑوسن کو اصل بات بتائی اور گوشت اُٹھا کر باہر کُوڑے کے ڈھیر پر پھینک آئے۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہمارے گھر مُحلّے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ ہر شخص ہمیں بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ جو زہریلا گوشت ہم نے گندگی کے ڈھیر پر پھینکا تھا، اُن لوگوں کی مرغیاں اُسے کھا کر دوسری دُنیا کو سدھار گئی ہیں۔

ابّا جان کسی کام کے سلسلے میں شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ وہ گھر واپس لوٹے تو امّی جان نے ہماری تمام داستان اُنہیں کہہ سُنائی۔ بس جناب، کچھ نہ پُوچھے۔ ابّا جان نے جو ہماری دُرگت بنائی وہ ہم ہی جانتے ہیں۔ البتہ اِس دُرگت کا ایک فائدہ ضرور ہوا۔ ہم نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگا کر کبوتر بازی جیسے فضول شوق سے توبہ کر لی۔

(چوتھا انعام 35 روپے کی کتابیں)۔

ایمان داری کا صلہ

عبداللہ عُرف شہزاد گل، پشاور شہر

"ابّو، کل 5 تاریخ ہے۔ اِسکول کی فیس دے دیں" میں نے ابّو سے کہا۔ اُنہوں نے کوٹ کی جیب سے بٹوا نکالا اور سو سو کے پانچ نوٹ مجھے دے دیئے۔ میں نے اپنے بستے سے فیس کارڈ نکالا اور اُس میں پانچ سو روپے رکھ کر واپس بستے میں رکھ دیا۔

صُبح اِسکول گیا تو پتا چلا کہ آج ہمارے کلاس ٹیچر نہیں آئے ہیں۔ اُن کی جگہ دوسرے اُستاد آئے تھے۔ اُنہوں نے حاضری لی اور حاضری کے بعد ہمیں بتایا کہ تمام لڑکے کل فیس لے کر آئیں۔ آپ کی فیس آپ کے کلاس ٹیچر ہی وصول کریں گے۔ میں نے بستے میں سے فیس کارڈ نکالا، اس میں سے نوٹ نکال کر بٹوے میں رکھے اور بٹوا کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ میرا خیال تھا کہ اِس طرح فیس کی رقم محفوظ رہے گی۔

چھُٹّی کے بعد گھر گیا تو امّی نے پُوچھا "بیٹے، اِسکول کی فیس دے دی؟"

میں نے کہا "امّی، آج ہمارے کلاس ٹیچر نہیں آئے تھے۔ کل آئیں گے تو دے دوں گا۔" یہ کہہ کر میں نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو بٹوا غائب تھا۔ میرے تو ہوش اُڑ گئے۔

امّی نے مجھے اِس حال میں دیکھا تو پُوچھا "بیٹے، کیا ہوا؟"

"امّی، بٹوا کہیں گر گیا ہے۔ اِسی میں فیس کے روپے تھے" میں نے جواب دیا۔ امّی بُرا بھلا کہہ کر چلی گئیں۔ رات کو ابّو نے بھی ڈانٹا۔

دوسرے دِن میں اِسکول گیا تو دوستوں سے اپنے بٹوے کے بارے میں پُوچھا۔ ہر لڑکا نفی میں سر ہلا کر چلا جاتا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہمارے کلاس ٹیچر آگئے۔ اُنہوں نے حاضری لی اور حاضری کے بعد ہر لڑکا باری باری فیس دینے لگا۔ جب میری باری آئی تو میں نے اُن کو ساری بات بتا دی۔ اُنہوں نے کہا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب سے بات کرو۔ میں نے ہیڈ ماسٹر صاحب کے دفتر میں جا کر اُنہیں یہ بات بتائی تو اُنہوں نے اپنی قمیص کی جیب سے ایک بٹوا نکالا، جسے دیکھ کر میں بہت خوش ہوا کیوں کہ وہ میرا ہی بٹوا تھا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے پُوچھا "یہی بٹوا ہے نا تمہارا؟"

"جی ہاں" میں نے جواب دیا "یہ آپ کو کہاں سے ملا؟"

ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا "تمہاری کلاس کی جو شخص صفائی کرتا ہے، یہ بٹوا اُسے ملا تھا۔ اس نے مجھے دے دیا۔ اُس کا نام شاید رحمت شاہ ہے۔" میں دِل ہی دِل میں رحمت شاہ کو دُعائیں دینے لگا۔ اگر وہ چاہتا تو یہ روپے لے سکتا تھا، مگر اُس نے ایسا نہیں کیا۔ آخری پیریڈ میں میں نے اپنی فیس دی، اور

گھر جا کر امّی ابّو کو بھی یہ بات بتائی۔ وہ بھی رحمت شاہ کی ایمان داری سے بہت خوش ہوئے۔

دو دن بعد ہمارے اِسکول میں ایک تقریب ہونے والی تھی۔ اِس تقریب میں اُن طلبار کو اِنعامات ملنے والے تھے جو سالانہ امتحان میں اول، دوم، اور سوم آئے تھے۔ اُس دِن میں خوب تیار ہو کر اِسکول گیا۔ اِسکول کا ہال سجا ہوا تھا۔ تقریب میں ہیڈ ماسٹر صاحب نے اُن طلبہ کو اِنعامات دیئے جو سالانہ امتحان میں اول، دوم اور سوم آئے تھے۔ آخر میں اُنہوں نے رحمت شاہ کی ایمان داری کا قِصّہ سُنایا اور اُسے اسٹیج پر بُلا کر سو روپے کا نوٹ اِنعام میں دے کر کہا "یہ تمہاری ایمان داری کا اِنعام ہے۔ اس کے عِلاوہ میں تمہاری تنخواہ میں بھی 100 روپے کا اضافہ کرتا ہوں۔"

(پانچواں اِنعام 30 روپے کی کتابیں)۔

ناقابلِ فراموش

عبدالماجد، دھت موڑ ضلع ایبٹ آباد

یہ اُن دِنوں کی بات ہے جب میں چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا۔ جُمعے کا دِن تھا، اِس لیے میں نے فجر کی نماز پڑھنے کے بعد سوچا کہ ایبٹ آباد جا کر ماموں سے مِل آؤں۔ ایبٹ آباد کا شہر ہمارے گاؤں دھت موڑ سے زیادہ دُور نہیں ہے، اِس لیے پیدل چلنے کا فیصلہ کیا اور آدھ گھنٹے بعد شہر پہنچ گیا۔

ابھی شہر میں داخل ہی ہوا تھا کہ عین چوراہے پر ایک الم ناک حادثہ پیش آیا۔ ہوا یُوں کہ ٹریفک کا انسپکٹر چوک میں ڈیوٹی پر کھڑا تھا۔ مال روڈ کی طرف سے ٹریفک کی آمدورفت رُکی ہوئی تھی، اور اسٹیڈیم روڈ کی طرف سے کاریں، رکشے، موٹر سائیکلیں وغیرہ تیزی سے آ رہی تھیں۔ اچانک "روکو! روکو! ہٹ جاؤ!" کا شور سُنائی دیا۔ ابھی لوگ پوری طرح اُدھر متوجّہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ ایک خالی تانگہ مخالف سمت سے پوری رفتار سے آتا ہوا نظر آیا۔ لوگوں نے اُس کو روکنے کی بہتیری کوشش کی، مگر گھوڑا اتنا بدکا ہوا تھا کہ کسی کے روکے نہ رُکا اور چوک میں پہنچ کر ایک دَم اسٹیڈیم روڈ کی طرف مُڑ گیا۔

اُدھر سے ایک کار آ رہی تھی جو تانگے سے ٹکرا گئی۔ گھوڑا پہلے ہی ڈرا ہوا تھا۔ کار سے ٹکرا کر اُچھلا اور اُس کے اگلے حِصّے پر چڑھ گیا۔ پھر کار کے سامنے کے شیشے کو ٹکڑے ٹکڑے کرتا ہوا تانگے سمیت ایک طرف گِر گیا۔ کار کا ڈرائیور اور مالک جو آگے بیٹھے تھے، سخت زخمی ہوئے۔ پچھلی سیٹ پر دو عورتیں اور ایک بچّہ بیٹھا ہوا تھا۔ وہ خوف کے مارے چیخیں مارنے لگے۔ تانگہ چُور چُور ہو گیا تھا۔ گھوڑے کی پچھلی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔

میں بے حس و حرکت کھڑا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ پھر اچانک جیسے مجھے ہوش آ گیا۔ میں کار کی طرف دوڑ پڑا، تاکہ اُن مصیبت زدہ لوگوں کی کچھ مدد کر سکوں۔ لیکن مجھ سے پہلے وہاں بہت سے لوگ پہنچ چُکے تھے۔ چند نوجوانوں نے اُن لوگوں کو گھسیٹ کر کار سے باہر نکالا۔ چند دردمندوں نے اُنہیں اپنی گاڑیوں میں ڈال کر جلدی سے ہسپتال پہنچایا۔ خُدا کا شکر ہے کہ تانگے میں کوئی شخص سوار نہ تھا، ورنہ اس کا بچنا ناممکن تھا۔

پولیس فوراً اُس جگہ پہنچ گئی اور اُس نے لوگوں کو وہاں سے ہٹایا۔ تانگے اور ٹوٹی ہوئی کار کو سڑک کے ایک جانب کیا۔ سب لوگ کار میں سوار لوگوں کے بارے میں اظہار افسوس کر رہے تھے۔ اتنے میں کوچوان ہانپتا کانپتا وہاں آ پہنچا۔ اس کا رنگ پیلا پڑ چُکا تھا۔ مُنہ سے خوف اور ڈر کے مارے آواز نہیں نِکل رہی تھی۔ لوگوں نے اُس کو لعن طعن کی تو اُس بے چارے نے روتے ہوئے کہا، "جناب، میرا قصور نہیں ہے۔ میں نے تو تانگہ سرائے کے نزدیک کھڑا کیا تھا اور خود حلوائی کی دُکان پر دُودھ پہنچانے چلا گیا تھا۔ کسی ظالم نے گھوڑے کو بھڑکا دِیا اور وہ خوف زدہ ہو کر دوڑ پڑا۔"

لیکن پولیس والے نہ مانے اور غفلت برتنے پر اُس کا چالان کر دیا۔ مجھ پر تو اس حادثے کا اتنا اثر ہوا کہ چلا بھی نہیں جا رہا

تھا۔ (چھٹا انعام 25 روپے کی کتابیں)۔

گداگری لعنت ہے

روبینہ شہزادی، مُرید کے

"باجی، دے دو نا ایک روپیہ۔ اللہ تمہارے پرچے اچھّے کرے گا۔ دے دو ایک روپیہ۔"

"بھئی میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ کہاں سے دُوں تمہیں روپیہ؟"

"دے دو، باجی۔" اُس گیارہ بارہ سال کی بھکارن لڑکی کی مسلسل ایک ہی رَٹ تھی اور روبی کے پاس آج ایک چونّی بھی نہیں تھی جو وہ اُسے دے دیتی۔ وہ گندی سندی سی لڑکی مسلسل اُس کا دامن پکڑ کر ایک ہی صدا لگا رہی تھی۔

روبی اُس سے اپنی قمیص چھُڑاتی تو وہ دوپٹا پکڑ لیتی۔ کسی طرح دوپٹا چھُڑاتی تو بیگ پکڑ لیتی۔ روبی بے چاری کی تو کم بختی ہی آگئی تھی۔ اُس لڑکی نے پیسے لینے کی قسم کھا رکھّی تھی۔

"چھوڑتی ہے کہ نہیں؟ لگاؤں گی ایک جھانپڑ۔ چھوڑ۔" اور روبی اپنا بیگ چھُڑا کے جلدی جلدی آگے بڑھ گی۔

جب لڑکی کو یقین ہو گیا کہ یہ پیسے نہیں دے گی تو وہ جو تھوڑی دیر پہلے اُس کو دُعائیں دے رہی تھی، اُسے گندی گندی گالیاں دینے لگی۔ اُسے گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے دیکھ کر روبی کا سَر چکرا گیا۔

روبی کا اِسکول نسبتاً سُنسان جگہ پر تھا، جہاں کچھ خانہ بدوش فقیروں کی جھونپڑیاں تھیں۔ روبی انہیں روز اِسکول سے آتے جاتے دیکھتی تھی اور یہ فقیر لڑکی بھی اُنہیں جھونپڑیوں میں سے ایک جھونپڑی میں رہتی تھی، بارہا روبی اُسے بھیک دے چکی تھی۔ لیکن آج تو اُس لڑکی نے حَد ہی کر دی تھی۔

لڑکی کا باپ بھی ایک پیشہ ور فقیر تھا۔ اُس کے پاس ایک ریڈیو اور سیلوں سے چلنے والا چھوٹا سا ٹی وی بھی تھا۔ وہ روز ریڈیو آن کر کے دھوپ میں بیٹھا بے ہودہ گیت سُنا کرتا تھا۔

اور وہ چھوٹی سی لڑکی بہن بھائیوں کے لیے تیل کے چولہے پر روٹیاں پکاتی اور اپنے چھوٹے چھوٹے لاتعداد بہن بھائیوں کو کھلاتی۔ روبی یہ سب بہت دلچسپی سے دیکھا کرتی تھی۔

آج اُس کی کلاس ٹیچر اُنہیں ایک مضمون پڑھا رہی تھیں، "گداگری ایک لعنت ہے۔" ٹیچر نے کلاس کو بتایا کہ کس طرح کچھ لوگ بھیک مانگنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور کس طرح کچھ لوگ اسے پیشہ بنا لیتے ہیں۔ اُن کو فقیر بنانے میں سب سے زیادہ قصور ہم لوگوں کا ہے۔

مِس کا یہ فقرہ سُن کر لڑکیاں بہت حیران ہوئیں۔ آخر روبی نے پُوچھ ہی لیا کہ مِس، ہم کیسے قصور وار ہیں؟ کیا ہم اُنہیں کہتے ہیں کہ بھیک مانگو؟ مِس ذرا سا مُسکرائیں اور بولیں "ہاں، ہمارا ہی قصور ہے۔ ہم انہیں بھیک دیتے ہیں تو ہم ان سے کہہ رہے ہوتے ہیں کہ ہاں بھئی، بھیک مانگو۔"

"پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" ایک لڑکی نے سوال کیا۔

"ہمیں چاہیے کہ ہم اُن لوگوں کو بھیک نہ دیں۔ بلکہ جو ہمارے اِرد گِرد غریب اور مستحق لوگ رہتے ہیں، اُن کی مدد کریں۔"

یہ سُن کر روبی کو اُس اندھی امّاں کا خیال آگیا جو اُن کی گلی کے نکڑ والے مکان میں رہتی تھی۔ اُس کو یہ بھی احساس ہوا کہ اگر وہ روز اُس بھکارن کو پیسے نہ دیتی تو وہ یُوں ہاتھ دھو کر اُس کے پیچھے نہ پڑتی اور پھر پیسے نہ ملنے پر اُسے بُرا بھلا نہ کہتی۔ اُس نے دِل ہی دِل میں عہد کیا کہ وہ آئندہ کبھی اِس قسم کے کسی فقیر کو پیسے نہیں دے گی اور ہمیشہ اُن غریب لوگوں کی مدد کرے گی جو اُس کی امداد کے مستحق ہوں گے۔

(ساتواں اِنعام 20 روپے کی کتابیں)۔

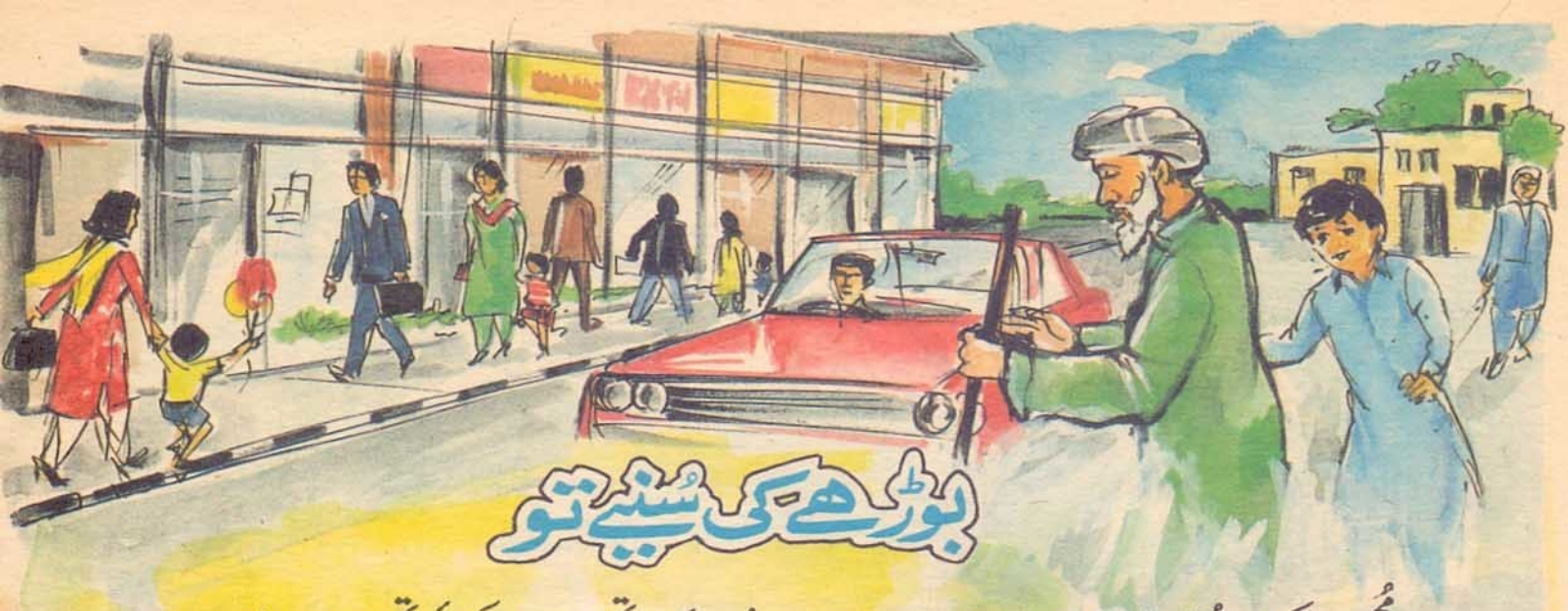

بوڑھے کی سُنیے تو

مُجھے ایک بُوڑھا مِلا راستے میں ☆ بہُت بھیڑ تھی، رہ دِکھائی تھی میں نے
بہُت پیار سے ہاتھ اُس کا پکڑ کر ☆ سڑک پار اُس کو کرائی تھی میں نے

وہ بھُوکا، وہ پیاسا، وہ کمزور، لاغر ☆ غریبی کے ہاتھوں ستایا ہُوا تھا
زمانے کا دُکھ اپنے دل سے لگائے ☆ وہ اپنے ہی غم میں سمایا ہُوا تھا

بڑے پیار سے اُس کو کھانا کِھلایا ☆ دِلاسا دیا، اُس کی ہِمّت بندھائی
روپے بھی اُسے کچھ دیے عاجزی سے ☆ وہ خوش ہو گیا اور بولا کہ "بھائی

کبھی میں بھی اِک مالدار آدمی تھا ☆ کبھی میری بھی عیش کی زندگی تھی
مِری اپنی کوٹھی تھی، کاریں تھیں، سچ مُچ ☆ بہُت مال و زر تھا، خوشی ہی خوشی تھی

مگر پھر ہُوا یہ کہ کچھ دوستوں نے ☆ بُرے چکّروں میں مجھے یُوں پھنسایا
بُری باتوں میں اور بُری صُحبتوں میں ☆ مِرے پاس جو کچھ تھا، میں نے گنوایا

مُقدّر جو بِگڑا تو دُنیا بھی بِگڑی ☆ مِرے ساتھ سب ہی بُرا کر گئے ہیں
نہ اب کوئی اپنا، نہ ساتھی، نہ ہمدم ☆ مرے سائے سے جیسے سب ڈر گئے ہیں

خُدا را! مجھے دیکھو، میری سُنو تم ☆ بُرائی کے نزدیک ہرگز نہ جانا
بُرے دوستوں سے سدا بچ کے رہنا ☆ کبھی دیکھو، اُن کے نہ کہنے میں آنا

مِری یہ دُعا ہے، سدا خوش رہو تم
جہاں تک بنے، سب کی خدمت کرو تم
بُرا ہو، بھلا ہو، خوشی اُس کو دے دو
کوئی بھی ہو، اُس سے مَحبّت کرو تم

فرحت شاہ جہان پوری

سبز پانیوں کے شہر

فوزیہ طاہرہ

شہزاد، ہوائی اڈّے کے لاؤنج میں بیٹھا، کبھی کلائی کی گھڑی کو دیکھتا تو کبھی سامنے دیوار پر لگے کلاک کو دیکھنے لگتا۔ یُوں لگ رہا تھا جیسے وقت ٹھہر گیا ہو۔ اُس کے بس میں ہوتا تو پلک جھپکتے میں ملائیشیا پہنچ جاتا۔

یہ اُس کا جہاز کا پہلا سفر تھا۔ اُس نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا کہ اُس کے ابّو اِس بار اُسے بھی اپنے ساتھ لے جانے پر رضامند ہو جائیں گے۔ اُس کی گود میں بیٹھی مُنّی مزے سے چوئنگ گم کی جُگالی کر رہی تھی۔ اُس کے ایک ہاتھ میں ٹافیوں کا پیکٹ تھا اور دوسرے میں آئس کریم کا کپ۔ آج تو جیسے شہزاد اور منّی کی عید تھی۔

"امّی جان، ہم جہاز میں کب بیٹھیں گے؟" شہزاد نے آخر تنگ آ کر پُوچھ ہی ڈالا۔

"بیٹا، ابھی اِعلان ہو گا کہ جہاز روانہ ہونے والا ہے۔ سب مُسافر جہاز میں بیٹھ جائیں" امّی نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

وقت گزارنے کے لیے شہزاد نے اُٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ آج وہ بہت خوش تھا۔ اب تک تو اُس نے ملائیشیا کی خوب صورتی کے چرچے سُنے تھے، لیکن کبھی اپنی آنکھوں سے بھی دیکھے گا، یہ تو اُس نے سوچا تک نہ تھا۔ جب کبھی اُس کا دوست راشد کوالالمپور کے قصّے سُناتا اور خوب بڑھ بڑھ کر ڈِینگیں مارتا تو اُس کو غصّہ آ جاتا۔ اب وہ بھی اپنی کلاس کے لڑکوں کو ملائیشیا کی سیر کے قصّے سُنائے گا۔ یہ سوچتے ہی بے ساختہ اُس کا سینہ خوشی سے پھول گیا۔ اُس کے کان وہ اِعلان سُننے کے لیے بے تاب تھے جب اُنہیں جہاز میں بیٹھنے کی اِجازت دی جائے گی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہُوا ایک ٹک شاپ کے قریب جا رُکا جو ایئر پورٹ لاؤنج کے دائیں ہاتھ تھی۔

"بیٹا، ذرا یہ بیگ تو پکڑنا" ایک اَدھیڑ عُمر کے شخص نے اپنے کاندھے سے ایک بیگ اُتارتے ہوئے کہا۔

شہزاد نے جلدی سے آگے بڑھ کر بیگ تھام لیا۔ اُس شخص کی عُمر پچاس پچپن کے لگ بھگ ہوگی اور تین چار بھاری بھاری بیگ اُس کے کندھوں پر لدے ہوئے تھے۔ اُس نے اپنا نام سیٹھ حشمت خان بتایا، اور کہا کہ وہ بھی کوالالمپُور جارہا ہے۔ شہزاد نے بھی اُس کو اپنے بارے میں بتایا کہ اُس کے والِد ریلوے میں چیف انجینئر ہیں اور ٹریننگ کے سلسلے میں 15 دن کے لیے کوالالمپور جارہے ہیں۔

شہزاد گفت گُو کے دوران میں بیگ ایک کاندھے سے دوسرے کاندھے پر کرتا رہا۔ یُوں لگتا تھا جیسے بیگ میں 10 کِلو پتّھر بھرے ہوں۔ اگرچہ اُس کے کندھے بیگ لٹکائے لٹکائے تھک چکے تھے لیکن وہ خاموش رہا۔ اُسے اپنے والد کی یہ نصیحت خوب یاد تھی کہ دُوسروں کا بوجھ بانٹ لینا بھی عِبادت ہے۔ بس یہی سوچ کر اُس نے بیگ اُٹھائے رکھا۔

سیٹھ حشمت خان کبھی اپنے کالے چشمے کو اُتار کر صاف کرنے لگتا، کبھی کِھسیانی سی ہنسی ہنس کر شہزاد کی پیٹھ پر ہلکی سی تھپکی دیتا اور کبھی بے وجہ پیچھے پلٹ پلٹ کر دیکھنے لگتا۔ ایک دو بار تو ٹھوکر کھاتے کھاتے بچا۔

اِسی دوران میں مائیک پر اِعلان ہُوا کہ جہاز روانگی کے لیے تیار ہے۔ شہزاد کی تو خوشی کی اِنتہا نہ رہی۔ اُس نے بیگ سیٹھ حشمت کو لَوٹانا چاہا تو اُس نے کہا کہ ہم ایک ہی جہاز میں تو سفر کر رہے ہیں۔ کوالالمپور ایئرپورٹ پر لے لوں گا۔ شہزاد کو اُس وقت جہاز میں بیٹھنے کی جلدی تھی۔ اُس نے زیادہ بحث نہیں کی اور بیگ اُٹھائے اُس طرف چل دیا جس جانب اُس کے امّی ابّو جارہے تھے۔

چند لمحوں بعد شہزاد اور منّی اپنے والدین کے ساتھ جہاز کی نشستوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ شہزاد کے والد نے دونوں بچّوں کی سیٹوں پر لگی ہوئی پیٹیاں اُن کی کمر میں باندھ دیں۔ ایئر

ہوسٹس نے بھی مسافروں کو کمر کے گرد پیٹی باندھنے کو کہا جب کہ دو اسٹیورڈ نے مسافروں کے سامنے کھڑے ہو کر پیٹیاں باندھ کر دکھائیں۔ شہزاد اور منّی کو یہ سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ یہ ڈبل اسٹوری یعنی دو منزلہ جہاز تھا۔ اُس نے اپنے امّی ابّو سے دو منزلہ بسوں کا تذکرہ تو سُنا تھا لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ جہاز بھی دو منزلہ ہوتے ہیں۔

جہاز کب رن وے پر دوڑا اور کب فضا میں اُڑنے لگا، اُسے کچھ پتا نہ چلا۔ وہ تو بس خیالوں ہی خیالوں میں کلاس روم میں بیٹھا اپنے دوستوں کو جہاز کا نقشہ سمجھا رہا تھا۔

"بھیّا، وہ دیکھو۔ رُوئی جیسے پیارے پیارے بادل" منّی نے جہاز کی کھڑکی سے باہر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

شہزاد منّی کی آواز پر چونک سا گیا اور باہر دیکھنے لگا۔

"ارے ہاں۔ ہر طرف بادل ہی بادل ہیں۔ لگتا ہے ہم بہت بلندی پر اُڑ رہے ہیں" اُس نے منّی سے کہا۔

"ہاں، بیٹے ہم اِس وقت 10700 فٹ کی بلندی پر پرواز کر رہے ہیں" شہزاد کے والد نے بچّوں کو بتایا۔

"ابّو جی، ہم ابھی تھوڑی دیر میں ملائیشیا پہنچ جائیں گے کیا؟" منّی نے چاکلیٹ سے پنّی اُتارتے ہوئے پوچھا۔

"ارے بھئی، اِتنی جلدی بھی نہیں۔ یہ جہاز ہے، جادو کا اُڑن کھٹولا نہیں ہے کہ پلک جھپکتے ہی اِتنی دور پہنچ جائیں۔"

منّی حیران حیران نظروں سے اپنے والد کی بات سُن رہی تھی۔ اُس کی امّی نے اُنہیں بتایا کہ ایک گھنٹا 25 منٹ بعد وہ کراچی پہنچیں گے اور چند گھنٹے وہاں رُکیں گے۔ پھر اگلے جہاز سے سیدھے کوالالمپور روانہ ہو جائیں گے۔ وہاں انکل ماجد کے ہاں ٹھہریں گے اور خوب سیر کریں گے۔ پھر پورے پندرہ روز بعد پاکستان واپس آ جائیں گے۔

شہزاد کو اپنا یہ وعدہ یاد تھا کہ میٹرک کے اِمتحان میں اُسے پہلی پوزیشن حاصل کرنا ہے اور اُس کے ابّو پیشگی اِنعام کے طور پر اُسے سیر کے لیے ملائیشیا لے جا رہے ہیں۔ اُس نے دل میں ٹھان لی تھی کہ وہ اپنے والدین کی اُمیدوں پر ضرور پُورا اُترے گا۔

"آپ کولڈ ڈرنک لیں گے یا کافی؟" ایئر ہوسٹس نے بڑے پیار سے شہزاد کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی، جی، کولڈ ڈرنک" اُس نے چونک کر کہا۔

"بھیّا، جہاز میں تو بڑے مزے ہیں۔ کبھی چاکلیٹ، کبھی جُوس۔ میں تو اب اِسکول بھی جہاز میں ہی بیٹھ کر جایا کروں گی۔" منّی کی یہ بات سُن کر شہزاد تو کیا آس پاس بیٹھے مسافر بھی کِھل کِھلا کر ہنس دیے۔

شہزاد کو وقت کا اِحساس ہی نہیں ہو رہا تھا۔ سفر کرتے ہوئے ایک گھنٹا گزر چکا تھا اور وہ باہر کے منظر سے لُطف اُٹھا رہا تھا کہ اُسے اچانک ایسا محسوس ہُوا جیسے جہاز فضا میں ٹھہر گیا ہے۔ سارے منظر بھی رُک گئے ہیں۔ وہ پریشان سا ہو گیا۔ اُس نے ایک نظر پیچھے بیٹھے مسافروں پر بھی ڈالی۔ لیکن سب مسافر بڑے اِطمینان سے بیٹھے ہوئے تھے۔ آخر اُس سے رہا نہ گیا اور اپنی پریشانی کا اِظہار اپنے ابّو سے کر ہی ڈالا۔ اُس کے والد پہلے تو مسکرائے اور پھر اُسے تسلّی دی کہ جہاز رُکا نہیں ہے، پہلے کی طرح اُڑ رہا ہے۔ وہ اُسے ٹی وی کی مثال دے کر سمجھانے لگے کہ جیسے ٹی وی اِسکرین پر فِلم تیزی سے چلنے کی وجہ سے ہمیں تصویر ٹھہری ہوئی لگتی ہے، بالکل ایسے ہی جہاز بہت تیز چلنے کی وجہ سے ہمیں ٹھہرا ہُوا محسوس ہو رہا ہے۔ یہ سُن کر شہزاد نے اِطمینان کا سانس لیا اور ایک بار پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

منّی سامنے اِسکرین پر انگلش فلم یُوں غور سے دیکھ رہی تھی جیسے سب کچھ اُس کی سمجھ میں آ رہا ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر چلّانے لگی۔ شہزاد کا جی چاہا کہ وہ منّی کو ڈانٹ پلائے۔ اُسے روتے بچّے بالکل پسند نہیں تھے۔ لیکن جانے کیوں، اُس کا اپنا جی بھی چاہنے لگا کہ زور زور سے رونا شروع کر دے یا پھر چلتے جہاز سے چھلانگ لگا دے۔

"ارے بھئی، کیا ہُوا؟" ابّو نے پوچھا۔

"ہمارے کان میں درد ہو رہا ہے" شہزاد اور منّی ایک

ساتھ بولے۔

شہزاد کے ابّو سمجھ گئے کہ ہوا کے دباؤ کی وجہ سے اُن کے کانوں میں درد ہو رہا ہے۔ جب وہ بھی پہلی بار جہاز میں بیٹھے تھے تو انہوں نے بھی اِسی طرح کانوں میں تکلیف محسوس کی تھی۔ شہزاد اپنے والد کے کہنے پر ایئرہوسٹس کے پاس گیا اور اُس سے تھوڑی سی رُوئی مانگی تاکہ کانوں میں ٹھونس لے۔

جب وہ رُوئی لے کر واپس آیا تو اُس کی نظر سیٹھ حشمت پر پڑی جو آخری نشست پر بیٹھا ہُوا تھا۔ اُس نے سیٹھ سے کہا "ارے انکل، آپ یہاں بیٹھے ہیں؟"

"بیٹا، میرا بیگ کہاں ہے؟"

"فکر نہ کریں، انکل۔ وہ مُنّی کے پاس ہے۔ کوالالمپور ایئرپورٹ پر آپ اپنی امانت لے لیجیے گا" اُس نے سیٹھ کو اِطمینان دلایا۔

کانوں میں درد کے باعث شہزاد کو جہاز کا سفر بُرا لگنے لگا تھا۔ اُس نے منّی سے کہا "اب بولو۔ جہاز میں اِسکول جایا کرو گی؟"

"میں تو بس گاڑی ہی میں جایا کروں گی" منّی ٹشو پیپر سے اپنی ناک رگڑتے ہوئے بولی۔

امّی نے بچّوں کو بتایا کہ چند منٹ بعد وہ کراچی پہنچ جائیں گے۔ کچھ دیر ہوائی اڈّے پر رُکیں گے اور پھر رات کی فلائٹ سے کوالالمپور روانہ ہو جائیں گے۔

شہزاد اور مُنّی کو ایک ایک منٹ بھاری معلوم ہو رہا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ منٹ کی چوتھائی میں کراچی پہنچ جائیں کہ ایک دم شہزاد کو ہلکی ہلکی گڑگڑاہٹ سی محسوس ہوئی۔ یوں لگا جہاز اُڑنے کی بجائے پتھریلی سڑک پر دوڑ رہا ہے۔

"ابّا جان، جہاز خطرے میں ہے کیا؟" شہزاد نے کہا اور پھر گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ لیکن سارے مُسافر مُطمئن بیٹھے ہوئے تھے۔ اُس کی پریشانی دیکھ کر ابّو مسکرانے لگے۔ وہ سمجھ گئے کہ شہزاد کیوں گھبرا رہا ہے۔ اُنہوں نے کہا "بیٹا، ہم اِس وقت کراچی ایئرپورٹ پر اُتر رہے ہیں۔ یہ گڑگڑاہٹ خطرے کی علامت نہیں۔ رن وے پر اُترتے وقت جہاز کے پہیے زمین پر لگتے ہیں تو ایسی آواز آتی ہے۔"

جب جہاز کراچی کے ہوائی اڈّے پر اُترا تو شام کے پانچ بج چکے تھے۔ مسافر اپنا دستی سامان اُٹھائے لاؤنج کی طرف بڑھنے لگے۔ شہزاد سیٹھ حشمت کی امانت کو اپنے کاندھے پر لٹکائے ہوئے تھا۔

"یہ بیگ کس کا ہے؟" اُس کے ابّو نے حیران ہو کر اُس کی طرف دیکھا۔

شہزاد نے تمام قصّہ اُنہیں سُنایا تو اُنہوں نے اُس کے جذبے کی قدر کی لیکن پھر بھی وہ چاہتے تھے کہ یہ امانت بخیر و خوبی اُس کے مالک تک پہنچ جائے۔ اگلی فلائٹ روانہ ہونے میں 3 گھنٹے باقی تھے۔ شہزاد کے والد اُنہیں لے کر ایک ریسٹورنٹ میں گئے اور وہاں اُنہوں نے چائے پی۔

وقت پَر لگا کر اُڑ رہا تھا۔ شہزاد اور منّی کے کانوں کا درد رفتہ رفتہ کم ہو چکا تھا۔ شہزاد اِس بات سے خوف زدہ تھا کہ اگلی پرواز میں پھر یہ تکلیف نہ شروع ہو جائے۔ لیکن اُس کے ابّو نے اُس کو اِطمینان دِلایا کہ اب ایسا نہیں ہو گا۔ اِسی اثنا میں کوالالمپور کی فلائٹ کے بارے میں مُسافروں کو آگاہ کر دیا گیا۔ لاؤنج میں ایک دو مرتبہ سیٹھ حشمت بھی دکھائی دیا جو حسبِ معمول بیگوں سے لدا پھندا تھا۔ شہزاد نے سوچا کہ اب کے جہاز میں یہ شخص مِل گیا تو بیگ اُس کے حوالے کر دے گا۔ لیکن اُس اکانومی کلاس میں جہاں شہزاد بیٹھا تھا، وہ کہیں نظر نہ آیا۔

جہاز اُس وقت پوری بلندی پر پرواز کر رہا تھا۔ شہزاد کے ابّو اُونگھ رہے تھے۔ منّی نے بھی امّی کی گود میں سر رکھ کر آنکھیں میچ لی تھیں۔ شہزاد نے موقع غنیمت جانا اور اُٹھ کر فسٹ کلاس کی طرف گیا تاکہ سیٹھ حشمت سے مل سکے۔ جب اُس نے سیٹھ کو فسٹ کلاس میں بیٹھے دیکھا تو اُس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اُس نے کہا۔

"انکل، اپنا بیگ لے لیجیے۔ کہیں کھو نہ جائے۔"

"اوہو! بیٹا۔ پریشان کیوں ہوتے ہو؟ یہ میرا فون نمبر رکھ لو۔ اگر کوالالمپور ایئرپورٹ پر رش کی وجہ سے ہم ایک دوسرے سے نہ مل سکیں تو گھر جا کر اِس نمبر پر مجھے فون کر دینا" سیٹھ حشمت نے ایک چھوٹی سی چِٹ شہزاد کو تھماتے ہوئے کہا۔

"جیسے آپ کی مرضی" شہزاد نے کہا اور بیگ اُٹھا کر اپنی نِشست پر بیٹھ گیا۔

رات خاصی بِھیگ چکی تھی۔ شہزاد نے بھی آنکھیں مُوند لیں اور کوالالمپور کے خوب صورت مناظر کے خواب دیکھنے لگا جہاں ہرن چوکڑیاں بھرتے ہوں گے، جھرنیں بہتے ہوں گے، ناریل اور پام کے سرسبز درخت اپنی بہار دکھا رہے ہوں گے۔

"بیٹا، بہت سو چکے۔ اب اُٹھ جاؤ۔ کوالالمپور کا ایئرپورٹ آ گیا" شہزاد کے ابّو نے اُسے ہلاتے ہوئے کہا۔

شہزاد آنکھیں ملتا ہُوا کھڑکی سے باہر تکنے لگا "ارے! واقعی ہم کوالالمپور پہنچ گئے ہیں" اُس نے خوش ہو کر نعرہ لگایا۔

(باقی اگلے مہینے)

اِدھر اُدھر سے

تِبّت کے ایک گاؤں "ڈانگ زی" میں گُزشتہ 50 سال سے کوئی شخص نہیں مرا ہے۔ یہاں 188 لوگ ایسے ہیں جن کی عمر 120 سال سے زیادہ ہے۔ تمام لوگ تن دُرست و توانا ہیں۔ کسی کو کوئی بیماری نہیں۔

سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ ڈانگ زی کے لوگوں کی تن دُرستی اور لمبی عُمر کا سبب یہ ہے کہ وہ صاف سُتھرے ماحول میں رہتے ہیں، آپس میں لڑتے جھگڑتے نہیں اور سادہ غذا اِستعمال کرتے ہیں۔ اِن کی خاص غذا لوبیا، چاول اور مچھلی ہے۔

امریکا کی ایک عدالت نے ایک شخص، کرلی کامپ ٹو، کو 30 سال قید کی سزا دی ہے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اُس نے کوئی بہت بڑا جُرم کیا ہو گا۔ جی نہیں۔ اُس نے صرف ایک چھوٹا سا مذاق کیا تھا، لیکن عدالت کے خیال میں اُس کے اِس مذاق سے 50 اِنسانوں کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔

پولیس کے بیان کے مُطابق کرلو کامپ ٹو ایسے جہاز میں سفر کر رہا تھا جس میں سِگرٹ پینے کی اِجازت نہیں۔ جب کرلو نے ایئرہوسٹس کے منع کرنے کے باوجود سِگرٹ نہیں بُجھایا تو ایئرہوسٹس نے اُس کے ہاتھ سے سگرٹ چھین لیا۔

کرلو نے ایک کاغذ پر کچھ لکھا اور ایئرہوسٹس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ کاغذ پر لکھا تھا "میرے سامان میں ایک نہایت طاقت وَر بم رکھا ہے۔ جہاز کو فوراً نیو یارک لے چلو۔ وہاں مجھے ایک کروڑ 30 لاکھ ڈالر دینا۔ اِس کے بعد جہاز کو کیوبا لے جانا۔ میں وہاں اُتر جاؤں گا۔ میرے دوسرے ساتھی میرے پیچھے بیٹھے ہیں۔"

ایئرہوسٹس نے اپنے ساتھیوں کو یہ بات بتائی اور اُنھوں کرلو کو پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیا۔ کرلو نے عدالت کو بتایا کہ اُس نے یہ سب کچھ ہنسی دل لگی کے لیے کیا تھا۔ لیکن عدالت نے اُس کا یہ عُذر تسلیم نہ کیا، اور اُسے 30 سال قید کی سزا دی۔

اِسلام آباد کی شاہ فیصل مسجد دُنیا کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ اِس کے ہال اور صحن میں ایک لاکھ نمازی سما سکتے ہیں، اور مزید 2 لاکھ مسجد سے ملے ہوئے میدان میں نماز پڑھ سکتے ہیں۔

تصویر کا سائز: 6" × 9"

جنگل کا بادشاہ

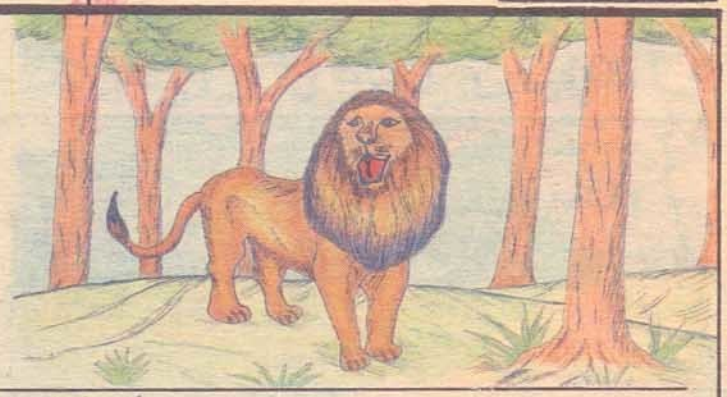

شاد محمد، پشاور (پہلا انعام 100 روپے کی کتابیں)

سیّد عبدالسلام رضوان، ربوہ (دوسرا انعام 75 روپے کی کتابیں)

محفوظ احمد، ٹنڈو آدم (تیسرا انعام 50 روپے کی کتابیں)

رشید احمد ارشد، چشتیاں (چوتھا انعام 25 روپے کی کتابیں)

سیّد مدثر حسین نقوی، کراچی (پانچواں انعام 20 روپے کی کتابیں)

فرح ناز، جہلم (چھٹا انعام 15 روپے کی کتابیں)

ان ہونہار مصوّروں کی تصویریں بھی اچھی ہیں:

وسیم احمد نسیم بھلوال۔ سلمان محفوظ منہاس لاہور۔ محمد لطیف اللہ قُریشی، نامعلوم۔ محمد احسن فاروق نارووال۔ سیّدہ کاشفہ خاتون کراچی۔ الیاس بادشاہ، فضل بادشاہ پشتون گڑھی۔ عمران سُہیل بوبی اوکاڑہ۔ نادیہ بھٹّی سیالکوٹ۔ محمد ذوالقرنین شاہین ٹبی لنڈان۔ صباحت منہاس لاہور۔ سیّد فہد حسن اِسلام آباد۔ محمد ظہیر ارشد لاہور۔ یار محمد پشاور۔ محمد اویس لالہ رُخ واہ کینٹ۔ ثمر انوار فیصل آباد۔ فاطمہ حمید لاہور۔ فیصل اصغر لاہور۔ شاہد احمد راولپنڈی۔ شیر الرحمان پشاور۔ آفتاب حسین ہری پور۔ عمر فاروق قلعہ دیدار سنگھ۔ محمد عبداللہ خان ملتان۔ امداد اللہ سرگودھا۔ دوست محمد پشاور۔ سیّد اِرتضیٰ کاظمی حاصل پور۔ سیّد خالد حسن۔ اِسلام آباد۔ نائیلہ مشتاق لاہور۔ زبیر احمد صدیقی کراچی۔

آخری تاریخ 10 جنوری

فروری: شیر کی خالہ

مارچ: چاند کی سیر

آپ اِن موضوعات میں سے جس موضوع پر چاہیں تصویر بنا سکتے ہیں۔

عظیم مسلمان

خواجہ نصیرالدین طوسی 1274ء — 1201ء

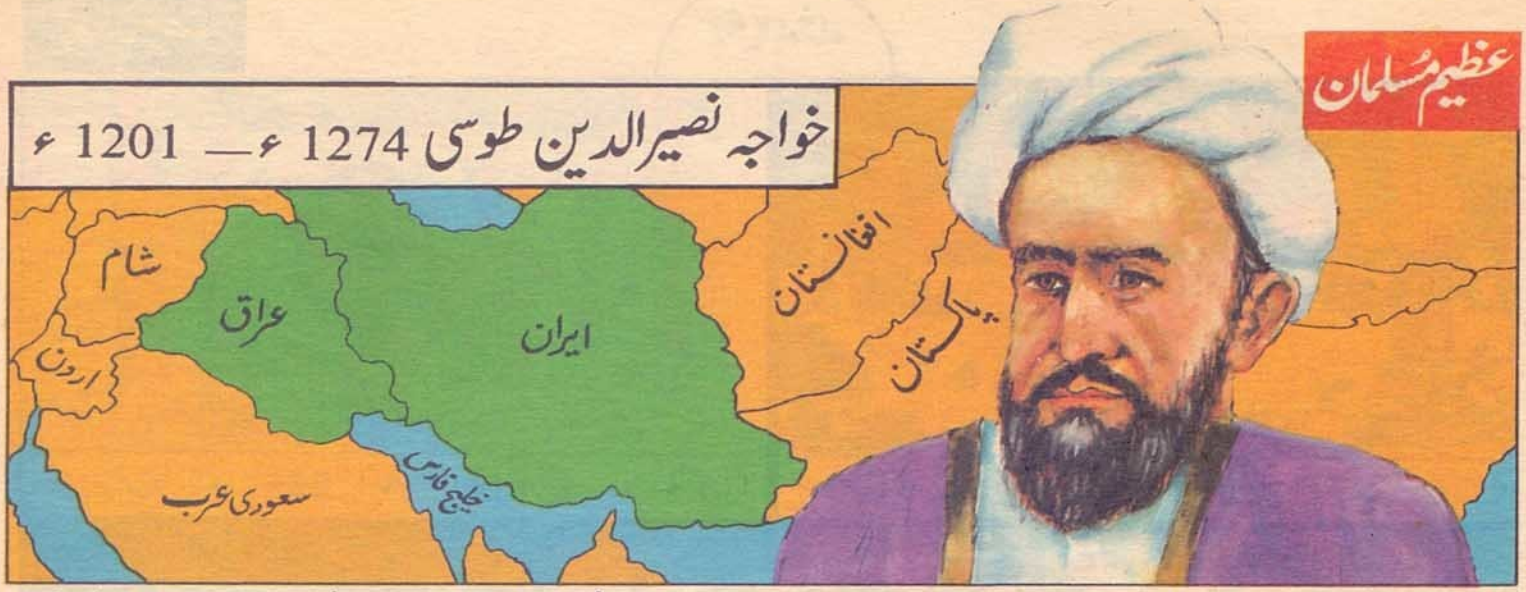

خواجہ نصیرالدین ابو جعفر محمد طوسی ایران کے مشہور قصبے طوس میں ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اپنی تعلیم اپنے آبائی قصبے میں ہی حاصل کی۔ عربی اور فارسی کے علاوہ آپ کو یونانی زبان میں بھی دسترس حاصل تھی۔ آپ نے چھوٹی عمر میں ہی طِب، ریاضی اور علمِ سیارگان میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ آپ کی علمی لیاقت کا اندازہ اِس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے زمانے میں منگولوں کے حملے شُروع تھے۔ خواجہ صاحب بھی جان بچانے کے لیے پہاڑی علاقے میں جا چُھپے۔ وہاں 1219ء میں آپ کو امیر ناصرالدین کے لشکریوں نے گرفتار کر کے شاہی دربار میں پہنچا دیا۔ باز پُرس پر جب امیر کو آپ کی علمی قابلیت کا پتہ چلا تو کہا کہ میرے دربار میں وزیر اعلیٰ کا عہدہ بڑی دیر سے خالی ہے۔ اِس کے لیے آپ سے موزوں شخص اور کون ہو گا۔ اس طرح اٹھارہ سال کی کم عمر میں ہی آپ کو اتنے اہم عہدے پر فائز کر دیا گیا۔ آپ کی پہلی تصنیف "اخلاق ناصری" اِسی امیر کے نام سے منسوب ہے۔

1256ء میں ہلاکو نے خراسان پر حملہ کر دیا۔ اِس حملہ کے دوران میں خواجہ نصیرالدین طوسی بھی گرفتار کر لیے گئے اور اُنہیں ہلاکو کے دربار میں پُہنچا دیا گیا۔ اِس خونخوار حکمران پر بھی آپ کی علمی قابلیت کا یہ اثر ہوا کہ آپ کو یہاں بھی وزیر کا عہدہ دے دیا گیا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ایک ظالم اور جابر بادشاہ ایک مسلمان عالِم سے اتنا متاثر ہوا کہ اس کے ہر ایک مطالبے کو بے چُون و چراں تسلیم کر لیتا تھا۔

خواجہ نصیرالدین طوسی نے ہلاکو خاں سے مطالبہ کیا کہ ستاروں کی حرکات کا مطالعہ کرنے کے لیے ایک اعلیٰ درجے کی رصد گاہ تعمیر کی جائے۔ اگرچہ ہلاکو خاں کو ستاروں کے مطالعہ سے کوئی دِلچسپی نہ تھی لیکن خواجہ صاحب کی خوشنُودی کی خاطر شاہی خزانے کے دروازے کھول دیئے اور اس طرح خواجہ صاحب کی نگرانی میں ایک وسیع علاقے میں نہایت ہی شاندار رصد گاہ تعمیر کرا دی۔ خواجہ صاحب نے دور و نزدیک کے بلند پایہ ریاضی دان اور علمِ سیارگان کے ماہرین کو بڑی بڑی تنخواہیں دے کر اپنی تجربہ گاہ میں بُلالیا۔ خواجہ صاحب نے پھر فرمائش کی کہ حضور رصد گاہ کے ساتھ ایک عالیشان کُتب خانہ بھی ہونا چاہیئے۔ ہلاکو خاں نے اِس کے لیے بھی منہ مانگا سرمایہ فراہم کر دیا اور اِعلان کر دیا کہ جو شخص بھی اِس شاہی کُتب خانے کے لیے کتاب لائے گا اُسے اِنعام و اکرام سے نوازا جائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ اِنعام کے لالچ میں کتابیں تلاش کر کر کے لاتے تھے اور منہ مانگے دام پاتے تھے۔ اِس طرح تھوڑے عرصے میں ہی کتابوں کا ایک اچھّا خاصہ سرمایہ جمع ہو گیا جِس کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی تھی۔

خواجہ نصیرالدین طوسی بہت سے علوم کے ماہر تھے۔ آپ نے جیومیٹری، ریاضی، فلسفہ، مذہب اور دوسرے موضوعات پر کئی ایک کتابیں تصنیف کیں۔ اِن میں خاص طور پر "اخلاق ناصری" بہت مشہور ہے۔ آپ نے 1274ء میں بغداد میں وفات پائی۔

عین الحق فرید کوٹی

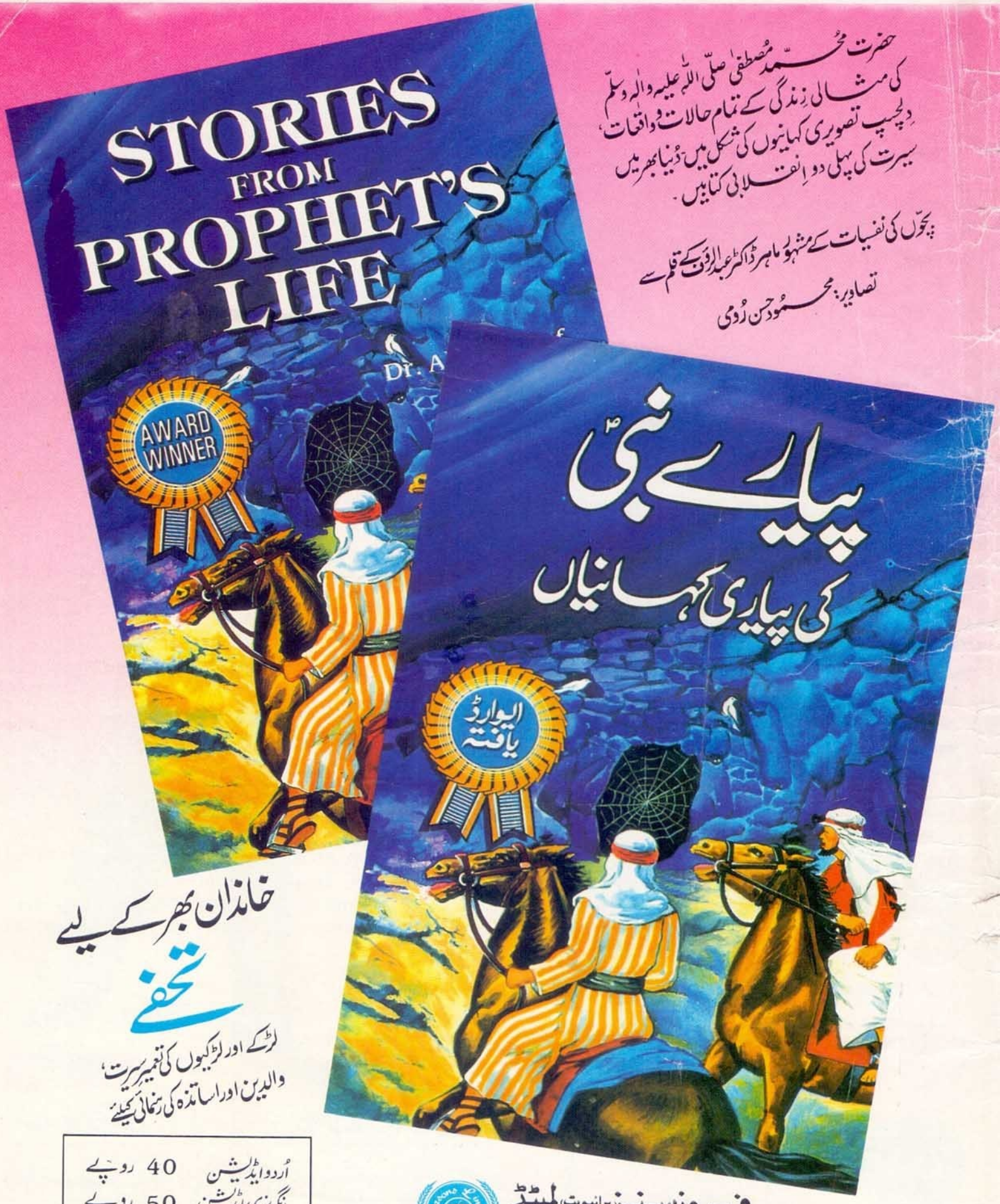

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم
کی مثالی زندگی کے تمام حالات و واقعات،
دلچسپ تصویری کہانیوں کی شکل میں دُنیا بھر میں
سیرت کی پہلی دو انقلابی کتابیں۔

بچوں کی نفسیات کے مشہور ماہر ڈاکٹر عبدالرؤف کے قلم سے

تصاویر: محمود حسن رُومی

خاندان بھر کے لیے

تحفے

لڑکے اور لڑکیوں کی تعمیرِ سیرت،
والدین اور اساتذہ کی رہنمائی کیلئے

اُردو ایڈیشن	40 روپے
انگریزی ایڈیشن	50 روپے

فیروز سنز پرائیویٹ، لمیٹڈ

لاہور ۔ کراچی ۔ راولپنڈی

R.L.No.4756
ISSN 969 0039 9175

The Taleem-o-Tarbiat, Lahore

PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES

Price Rs. 12.00

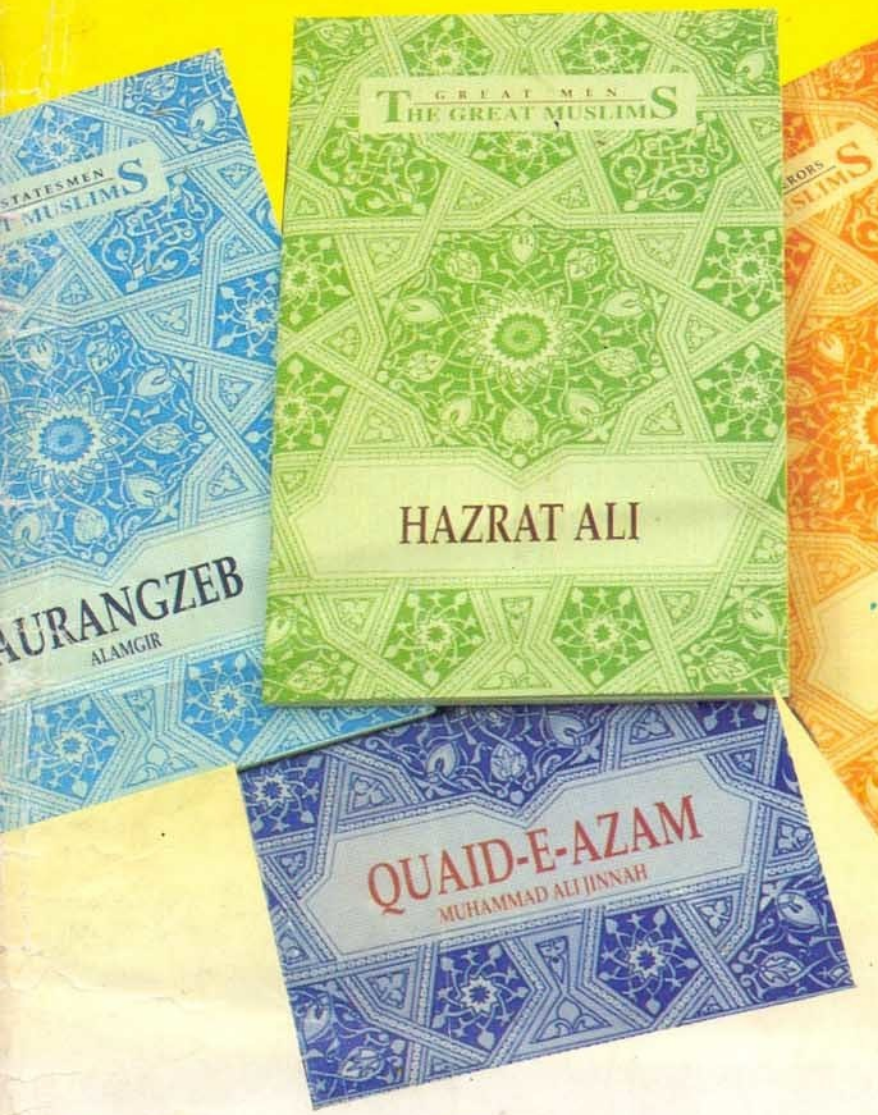

پاکستان میں پہلی بار

فیروز سنز بچوں کے لیے تاریخ اسلام کی نامور شخصیات کے حالات زندگی پر مشتمل انگریزی زبان میں کتابوں کی سیریز پیش کرتے ہیں۔ ان دیدہ زیب کتابوں میں نامور مسلمانوں کی سوانح حیات عام فہم اور نہایت آسان زبان میں بیان کی گئی ہے جو بچوں کے علاوہ بڑوں کے لیے بھی یکساں دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔ چھپائی کا معیار اعلیٰ اور قیمت نہایت مناسب ہے۔

The Great Muslims

Ferozsons is proud to present a pioneer series of easy-to-read English books, entitled *"**The Great Muslims**"*. These delightful and attractively designed books unfold the life-stories of Muslim heroes in a most captivating way. Appealing to young and old alike, the books in this series provide informative pleasure reading as well as supplementing text books already in use in schools. *Quality books at a nominal price!*

The following books in this series are available

* Hazrat Abu Bakr * Hazrat Umer * Hazrat Usman *Hazrat Ali * Quaid-e-Azam
* Hazrat Umar bin Abd al-Aziz * Tipu Sultan * Aurangzeb Alamgir

ہدایات برائے آرڈرز :

سندھ اور بلوچستان پہلی منزل، مہران ہائیٹس، مین کلفٹن روڈ۔ کراچی فون : 570527
570534-537730

پنجاب 60 شاہراہ قائدِ اعظمؒ۔ لاہور 301196-98

صوبہ سرحد، اسلام آباد، آزاد کشمیر اور قبائلی علاقے 277 پشاور روڈ۔ راولپنڈی 63503-64273

فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
لاہور ۔ راولپنڈی ۔ کراچی